سہ ماہی

اسلامی انقلاب

جلد ۱، شمارہ ۲

اپریل تا جون ۲۰۲۵ء

islami.inqilaab@gmail.com

https://islamiinqilaab.blogspot.com/

مدیر
علی محمد رضوی

سہ ماہی
اسلامی انقلاب

نائب مدیر
سید ارشد

مدیر منتظم: امین اشعر، مدیر معاون: صابر علی ☆ جلد ۱، شمارہ ۲۔ اپریل تا جون ۲۰۲۵ء
مجلسِ تحریر: جاوید اکبر انصاری، سید یونس قادری، غلام جیلانی خان، سید ارشد، امین اشعر، صابر علی، علی محمد رضوی، کاشف شیخ، جاوید شیخ، مولانا حبیب الرحمٰن، سید رفیع الدین ہمدانی

فہرست مضامین

حمد باری تعالیٰ	حضرت شمس تبریز	۳
نعت شریف	امداد اللہ مہاجر مکی	۴
اداریہ: ہمارے حلقے کے بارے میں چند باتیں	مدیر	۵
شیعہ سنی اتحاد سامراج کو شکست دینے کے لیے۔۔۔	جاوید اکبر انصاری	۱۱
عمران خان کی مخالفت کی ضرورت	جاوید اکبر انصاری	۱۴
معلم اولین و آخرین ﷺ کی تعلیمات	مولانا ڈاکٹر عبد الحی	۱۸
اصطلاحات کا دھوکا انسانی حقوق کے تناظر میں	حبیب الرحمٰن	۳۰
اقوام متحدہ کے "ہیومن رائٹس چارٹر" کا محاکمہ	حبیب الرحمٰن، رفیع الدین ہمدانی	۳۸
گروہی عصبیت کا سراب	جاوید اکبر انصاری	۵۶
کیا عوامی خواہشات کی تکمیل کی جدوجہد اقامتِ دین	جاوید اکبر انصاری	۶۸
کیا سرمایہ داری کی سبز کاری ممکن ہے؟	جاوید اکبر انصاری	۷۶
سبز سرمایہ داری کا سراب	صابر علی	۸۴
قرض کی معیشت کیا ہے؟	محمد یونس قادری	۹۱
احیاءِ اسلامی تمویلی نظام: امام غزالی کی فکر کی روشنی۔۔	محمد یونس قادری	۱۱۷
کیا جماعتِ اسلامی ایک انقلابی جماعت ہے؟	جاوید اکبر انصاری	۱۲۴

مطالباتی سیاست اور اسلامی انقلابی عمل	جاوید اکبر انصاری	۱۳۴
جہادِ فلسطین: امکانات اور خدشات	جاوید اکبر انصاری	۱۴۰
امریکا کی فلسطینیوں کی بے دخلی کی حکمت عملی۔۔۔	محمد یونس قادری	۱۴۶
پروفیسر بیونگ چل ہان کے مضمون پر تبصرہ	جاوید اکبر انصاری	۱۵۳
سرمایہ دارانہ نظام: ایک تعارف (تقریظ)	امین اشعر	۱۵۸
الحاد جدید کورسز	مولانا ندیم الرشید	۱۶۲

Economic Prospects for 2025 and the Proposed Islamic Revolutionary Response	Javed Akbar Ansari	170
On Possibility of Revolution: Islamic Versus Marxist critiques of Capitalist Order	Dr. Syed Z. Arshad	183
Capitalist Crisis and Contemporary Critical Theory	Javed Akbar Ansari	213
Why Islamic Revolution?	Javed Akbar Ansari	221
Reform and Revolution	Javed Akbar Ansari	227
Review: Individuation and the Islamic Revolutionary Process	Javed Akbar Ansari	233
Book Review: *The Palestine Laboratory*	Dr. Syed Z. Arshad	239

حمد باری تعالیٰ

حضرت شمس تبریز رحمۃ اللہ علیہ

مالک الملک لا شریک له
وحــــده لا الهٰ إلا هـو
عاشقان جان و دل نثار کننـد
بـــر در لا الهٰ إلا هـــو
مصطفیٰ یافت در شب معـراج
خلعــت لا الهٰ إلا هـــو
صوفیاں گر بهشت می طلبند
ذکـر شـاں لا الهٰ إلا هـو
باغبـــان قدیم لم یزلی
صفـتش لا الهٰ إلا هـو
طوق لعنت فگند بر ابلیـس
حیـــرتش لا الهٰ إلا هـو
مومـنـاں را نعیم شد روزی
برکـتش لا الهٰ إلا هـــو
خوش درختی است در میان جناں
مــیوه اش لا الهٰ إلا هـو
شمس تبریز گــر خدا طلبی
خوش بخـواں لا الهٰ إلا هـو

نعت شریف

امام جہاد مرشد انقلابیاں حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ

رفتم چو بمکہ ہوسِ کوئے تو کردم　　دیدم رخِ کعبہ ہوسِ روئے تو کردم

جب میں مکہ گیا تو میرے دل میں تمہارے کوچے کی آرزو تھی۔ کعبہ کا رخ دیکھا تو دل میں تمہارا رخ دیکھنے کی آرزو ہوئی۔

محرابِ حرم گرچہ بہ پیش نظرم شد　　من سجدہ دلے در خمِ ابروئے تو کردم

اگرچہ حرم کعبہ کی محراب میری نظر کے سامنے تھی لیکن میں نے سجدہ صرف تمہارے خم ابرو ہی میں کیا۔

در سعی و طواف و بحطیم بمقامے　　ہر سمت تمنا رخ نیکوئے تو کردم

سعی میں، طواف میں، حطیم میں اور مقام ابراہیم پر ہر جگہ ہر طرف میں نے تمہارے کوچے کے رخ کی تمنا کی۔

لبیک دعا خواں ہمہ مخلوق بعرفات　　چوں قبلہ نما من دلِ خود سوئے تو کردم

میدانِ عرفات میں ساری مخلوق لبیک کہہ کر دعائیں مانگ رہی تھی لیکن میرا دل قبلہ نما کی طرح صرف تمہاری طرف متوجہ تھا۔

در عرصہ عرفات بپا حشر نمودم　　چوں یاد من آں قامتِ دل جوئے تو کردم

میدانِ عرفات میں قیامت بپا کر دی، میں نے اپنے دل میں تمہارے دل پسند قد کا تصور کر کے

قربانی حیواں بمنیٰ میکند عالم　　قربان سرِ خود من بسر کوئے تو کردم

مقامِ منیٰ پر ایک دنیا جانوروں کی قربانی دیتی ہے، میں نے تمہارے کوچے کے سرے پر اپنا ہی سر قربان کر دیا۔

انتخاب و ترتیب: صائمہ جیلانی

اداریہ: ہمارے حلقے کے بارے میں چند باتیں

...إِنَّهُمْ فِتْيَةٌ آمَنُوا بِرَبِّهِمْ.... (الکھف، ۱۳)

۱. ہمارے حلقے کا کوئی علیحدہ تنظیمی ڈھانچہ یا تشخص نہیں ہے۔ ہم پاکستان وماجوار میں موجود عمومی اسلامی کام کا حصہ ہیں۔ ہمارے حلقے میں شامل تمام افراد کسی نہ کسی اسلامی جماعت سے وابستہ ہیں۔ ہماری بنیادی وابستگی وفاداری اللہ عزوجل ورسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد مسلمانوں کی عمومی جماعت اور ان مخصوص اسلامی جماعتوں سے ہے جو مسلمانوں کے عمومی اجماع کے اندر ہیں اور مقاصد دین میں سے کسی نہ کسی مقصد کے حصول کے لیے کام کر رہی ہیں اور امت کی طرف سے فرض کفایہ ادا کر رہی ہیں۔

۲. اس حلقے کے مرکزی لوگوں کا تعلق جماعت اسلامی سے ہے گو کہ ان کے مذہبی اور مسلکی تناظر مختلف ہو سکتے ہیں۔ مثلاً بعض حضرت کا تناظر دیوبندی ہے بعض کا سیاق بریلوی ہے اور بعض کا اہل حدیث ہے۔

۳. عملی لحاظ سے ہمارا اہم ترین ہدف یہ ہے کہ مغرب کا جو فہم اللہ تعالی نے ہمیں دیا ہے اس کو اسلامی جماعتوں اور علماء تک پہنچایا جائے۔ ہمارے کام کا دوسرا بنیادی مقصد اس فہم کی بنیاد پر جس کا اوپر ذکر ہوا ایسے افراد کی تیاری ہے جن کو مغرب کا عمیق فہم ہو اور وہ ان بصائر کی بنیاد پر مغربی نظام فکر و عمل کے مختلف پہلوؤں پر علمی، عملی، ادارتی فہم کو مسلسل حاصل کرتے رہیں اور اس کو گہرا بناتے رہے اور اس کو علماء تک پہنچاتے رہیں۔

۴. عملی لحاظ سے ہم نے دو بنیادی ایشوز پر ایجیٹیٹ (agitate) کیا ہے۔ پہلا یہ ہے کہ جماعت اسلامی کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ لبرل اور سوشل ڈیموکریٹک پالیسیاں ترک کر دے۔ اس سے مسلسل یہ استدعا کی ہے کہ وہ غیر انقلابی پالیسیوں کو خیر باد کہہ دے اور سوٹوں میں ملبوس استعمار کے گماشتوں کے پیروی چھوڑ کر علماء کے پیچھے چلنے کی روش اختیار کرے۔ علماء کو ہر سطح پر قیادت دے اور علماء کی

قیادت کے لیے اس ملک کو اور اس معاشرے کو تیار کرے۔ یہی اس کا کام ہے۔ اس کا فریضہ ہے کہ استعمار اور سرمایہ داری کا مقابلہ کرنے کے لیے علمی، عملی، اور ادارتی وسائل فراہم کرے۔ وہ علماء کی خادم جماعت ہے۔ اسے چاہیے کہ وہ علماء کی خادم جماعت بنے اور علماء کی خادم جماعت بن کر رہے۔

۵. اس کے مقابلے میں یہ بھی کوشش کی ہے کہ علماء کی جماعت اسلامی کے بارے میں جو غلط فہمیاں ہیں وہ دور ہوں۔ علماء سے مسلسل یہ گزارش کی ہے کہ وہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وارث ہیں اور انہیں اس وراثت کے تمام پہلوؤں کو اپنے ذمے لینا چاہیے۔ اس وراثت کے انفرادی اور اجتماعی پہلوؤں کو تو انہوں نے الحمد للہ ادا کیا ہے لیکن اس کے سیاسی، انقلابی اور ریاستی پہلوؤں سے، خاص طور پر استعمار کے غلبے کے بعد، انہوں نے بوجوہ صرف نظر کیا ہے۔ انکا فرض ہے کہ وہ اس وراثت کے سیاسی اور ریاستی پہلوؤں میں امت کی قیادت کی زمام کار کو دوبارہ اپنے ہاتھ میں لیں۔ اس کے بغیر اسلامی کام اسلامی نہیں رہے گا۔

۶. جماعت اسلامی اور علماء سے جو ہماری گذارشات ہیں وہ اپیل سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی ہیں۔ یہ گذارش ہے کہ وہ انقلابی حکمت عملی اپنائیں۔ گذارش ہے کہ وہ مسلمانوں کی قیادت سنبھالیں۔ اس کے لیے اگر لائحہ عمل بنانے کا حکم دیتے ہیں تو وہ بنا کے دیتے رہے ہیں اور دیتے رہیں گے۔ گذارش ہے کہ تفرقہ بازی ختم کریں وغیرہ۔ لیکن یہ سب گذارشات ہیں۔ ان پہ اگر وہ عمل کریں تو فبہا، اور نہ کریں تو وہ خود ہی اس کے ذمہ دار ہوں گے اور اس کی جواب دہی بھی ان پر ہی ہو گی۔ ہم کسی سازش کے قائل نہیں اور نہ ان جماعتوں اور علماء کے خلاف کسی سازش کا حصہ بنیں گے۔

۷. ہم پاکستان میں موجود تمام مین سٹریم اسلامی جماعتوں کے کلی وفادار ہیں اور ہمارا مقصد موجود اسلامی کام، جماعتوں اور اداروں کو مضبوط کرنا ہے کمزور کرنا نہیں ہے۔ ہماری تمنّا ان کی فتوحات کو وسعت دینا ہے نقصان پہنچانا نہیں ہے۔ ہمارا مقصد دیوبندیت کو

مضبوط کرنا ہے۔ ہمارا مقصد بریلویت کو مضبوط کرنا ہے۔ ہمارا مقصد اہل حدیث کی جماعت کو مضبوط کرنا ہے۔ ان کو کمزور کرنا نہیں ہے۔ لوگوں نے تیس چالیس سال پہلے ہم پر الزام لگایا کہ ہم جماعت اسلامی کو اور جمعیت کو ہائی جیک کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ہمارے تیس چالیس سالہ کردار نے اس دعوے کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ انشاءاللہ دوسرے تمام الزامات سے بھی دامن بچاتے ہوئے عنقریب اپنے رب سے ملیں گے۔

۸. ہمارے کام کی اسلامی کام میں کلی پیوستگی کی یہ دلیل ہے کہ یہ اسٹڈی سرکل ہمیشہ یا تو جماعت اسلامی کے اداروں میں یا دیوبندی مدارس میں یا بریلوی مدارس میں منعقد ہوا ہے یا گاہے بگاہے ان جماعتوں اور اداروں سے منسوب لوگوں کی ذاتی رہائش گاہوں پر ہوا ہے۔

۹. اس کی عملی دلیل یہ بھی ہے کہ جماعت اسلامی اور علماء کی جماعتوں نے جب بھی ہمیں جس کام کے لیے بھی بلایا ہے ہم نے اس پر لبیک کہا ہے۔ اس کی تفصیل تو یہاں نہیں بتائی جاسکتی کہ یہ کام ہمیشہ جاری رہتا ہے اور علماء جو بھی حکم دیتے ہیں اس کی تعمیل کی جاتی ہے۔ اسلامی جماعتوں کے قائدین عملی مدد چاہتے ہیں تو اس کی بھی تعمیل کی جاتی ہے۔

۱۰. ہمارا ایک سب سے بڑا اور اہم کام قائم اسلامی حکومتوں کو مدد فراہم کرنا ہے۔ اس لیے آج ہمارے کام کا بہت بڑا اور اہم حصہ اس ایکسپرٹیز کی بنیاد پر جو اس حلقے کے مختلف افراد کے پاس ہے امارات اسلامی افغانستان کو عملی، فکری و ٹیکنکل مدد فراہم کرنا ہے۔ افغان اکنامک گروپ، جو اس حلقے کے افراد پر مشتمل ہے، اس کام کا ایک اہم حصہ ہے۔

الغرض، ہم تمام مسلمانوں کے خیر خواہ ہیں اور اللہ سے دعا کرتے ہیں مسلمانوں کے بارے میں ہمارے دل میں کوئی بغض نہ رکھے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ استعمار کے گماشتوں چاہے وہ سوٹوں میں ملبوس ہوں چاہے وہ جبوں میں ملبوس ہوں ان کے لیے ہمارے دل میں حقارت و

نفرت کے سوا کچھ نہیں پائیں گے:

﴿وَالَّذِيْنَ جَاءُوْا مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ آمَنُوْا رَبَّنَا اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾[الحشر:۱۰]

اور ان کے بعد آنے والے عرض کرتے ہیں: اے ہمارے رب! ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو بخش دے جو ہم سے پہلے ایمان لائے اور ہمارے دل میں ایمان والوں کے لیے کوئی کینہ و بغض نہ رکھ، اے ہمارے رب! بے شک تو نہایت مہربان، بہت رحمت والا ہے۔

قال الإمام الرازي: واعلم أن هذه الآيات قد استوعبت جميع المؤمنين لأنهم إما المهاجرون، أو الأنصار، أو الذين جاءوا من بعدهم، وبين أن من شأن من جاء من بعد المهاجرين والأنصار، أن يذكر السابقين، وهم المهاجرون والأنصار بالدعاء والرحمة، فمن لم يكن كذلك، بل ذكرهم بسوء كان خارجا من جملة أقسام المؤمنين، بحسب نص هذه الآية

امام رازی فرماتے ہیں کہ یہ آیت تمام مومنین اور ان کی تمام اقسام کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مومنین یا تو مہاجرین میں سے ہوں گے یا انصار میں سے ہوں گے اور یا وہ لوگ ہوں گے جو مہاجرین اور انصار کے بعد آئے۔ آیت کریمہ میں ان مومنین کے بارے میں جو مہاجرین اور انصار کے بعد آئے یہ فرمایا گیا کہ وہ ان کا ذکرِ خیر کرتے ہیں اور ان کے لیے رحمت کی دعا کرتے ہیں۔ پس اس آیت شریفہ کی نص سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو لوگ ایسا نہیں کرتے وہ اس مسئلے میں حقیقی مومنین کی روش کے خلاف روش اپناتے ہیں۔

﴿أَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ۚ وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهُ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ۚ فَأَمَّا الزَّبَدُ

فَيَذْهَبُ جُفَآءً وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ۚ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْأَمْثَالَ ﴾[الرعد:۱۷]

اس نے آسمان کی جانب سے پانی اتارا تو وادیاں اپنی (اپنی) گنجائش کے مطابق بہہ نکلیں، پھر سیلاب کی رَو نے ابھرا ہوا جھاگ اٹھالیا، اور جن چیزوں کو آگ میں تپاتے ہیں، زیور یا دوسرا سامان بنانے کے لئے اس پر بھی ویسا ہی جھاگ اٹھتا ہے، اس طرح اللہ حق اور باطل کی مثالیں بیان فرماتا ہے، سو جھاگ تو (پانی والا ہو یا آگ والا سب) بے کار ہو کر رہ جاتا ہے اور البتہ جو کچھ لوگوں کے لئے نفع بخش ہوتا ہے وہ زمین میں باقی رہتا ہے، اللہ اس طرح مثالیں بیان فرماتا ہے۔

قال ابنُ عبَّاسٍ رضي الله عنهما: (هذا مثَلٌ ضربه الله، احتملتِ القلوبُ من الوحي على قَدر يقينها وشكِّها، فأمَّا الشكُّ فما ينفع معه العمل، وأمَّا اليقينُ فينفع الله به أهلَه).

اس آیت شریفہ کی تفسیر میں عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ تعالی عنہما سے منقول ہے کہ اللہ تعالی نے اس مثال کے ذریعے مومنین کو یہ سمجھایا ہے کہ لوگوں کے دل وحیٔ ربانی یعنی قرآن مجید اور اس کی حکمت کے فہم کے قابل اسی قدر ہوتے ہیں جس قدر ان کے دل اس فہم کے تحمل کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ جو دل یقین کی نعمت سے مزین ہوں وہ اس وحی سے اور اس کی حکمتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں جبکہ وہ دل جو شک وریب کے مرض میں مبتلا ہوں اس وحی اور اس کی حکمت سے چنداں فائدہ نہیں اٹھاسکتے۔

إمامنا الإمام مالك رضي الله عنه حين ألف الموطأ فقيل له إن فلانا ألف مثله منافسة لك فقال:ما كان لله يبقى ويدوم وما كان لغيره يذهب ويزول.

امام مالک امام مدینہ رضی اللہ تعالی عنہ کی کتاب مؤطا قرآن مجید کے بعد اسلام میں قدیم ترین کتاب ہے جو ہم تک پہنچی ہے۔ امام مالک سے پہلے اور ان کے معاصرین میں سے بھی بہت سے

لوگوں نے کتابیں لکھیں، مؤطائیں لکھیں، لیکن ان میں سے کوئی ہم تک نہیں پہنچی۔ وہ زمانے کی دست برد سے محفوظ نہیں رہ سکیں۔ امام مالک ہر سال اپنی کتاب کا جائزہ لیتے تھے اور ہر سال اس میں کمی کرتے تھے۔ ان کے شاگردوں نے ان سے پوچھا کہ حضرت کیا بات ہے کہ دوسرے لوگ اپنی کتابوں میں اضافہ کر رہے ہیں اور آپ ہر سال اپنی کتاب میں کٹوتی کرتے ہیں تو اس پر آپ نے اپنا یہ تاریخ جملہ ارشاد فرمایا تھا کہ: جو خدا کے لیے ہے وہ باقی رہے گا۔

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللهِ بَاقٍ وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (آیہ ۹۶ سورہ نحل)

آنچہ نزد شماست پایان می یابد و فنا می شود اما آنچہ نزد خدا است باقی می ماند و ماھر آینہ صابران را پاداشی بہتر از آنچہ بہ جای آوردہ اند عطا خواھیم کرد.

جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ خرچ ہو جانے والا ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہی باقی رہنے والا ہے اور ہم ضرور صبر سے کام لینے والوں کو ان کے اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق دیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ...

وَتُبْ عَلَيْنَآ إِنَّكَ أَنتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ

اللَّهمَّ صلِّ وسلِّم وبارك على النَّبي الأمِّي، سَيِّدِنا محمد المختار، وعلى آلِهِ الأطهار، وأصحابه الأخيار آمين يا رب العالمين

شیعہ سنی اتحاد سامراج کو شکست دینے لیے ناگزیر ہے

جاوید اکبر انصاری

سنی شیعہ تنازعہ کو فروغ دینا انیسویں صدی سے لے کر آج تک سامراجی حکمت عملی کا ایک جزو رہا ہے جو مشرق وسطیٰ اور برصغیر پاک و ہند میں سامراجی قوتیں (برطانیہ، فرانس، اٹلی اور امریکا) پروان چڑھاتی رہی ہیں۔ آج اس مہم کا بنیادی ہدف اسلامی جمہوریہ ایران کو مسلم دنیا سے کاٹنا ہے تاکہ وہ انقلابی لہر جو ۷۹-۱۹۷۸ء میں ایران میں ابھری جلد از جلد معدوم ہو جائے۔

مسلم دنیا میں اسلامی جمہوریہ ایران کو مطعون کرنے کے لیے جو جھوٹ بولا جا رہا ہے وہ حسب ذیل ہے:

۱۔ ایران کی شام کی حکومت کی حمایت خالصتاً شیعت کی بنیاد پر تھی۔

۲۔ ایران کی یمن کی اسلامی تحریک اور حزب اللہ کی پشت پناہی بھی شیعہ عصبیت کی بنیاد پر ہے۔

۳۔ ایران امریکا کا درپردہ حلیف ہے اور اس نے صرف شیعت کو پھیلانے کے لیے امریکا کی خلیجی جنگ لڑی۔

۴۔ شام میں ایرانی مداخلت کا مقصد سنی اکثریت کو دبائے رکھنا تھا۔

۵۔ ایران نے شیعت کو فروغ دینے کے لیے یمن کی اسلامی حکومت کو سعودی عرب سے لڑوایا۔

۶۔ ایران نے حزب اللہ کو سنی مسلمانوں کو کمزور کرنے کے لیے استعمال کیا اور امریکا بھی حزب اللہ کا حلیف بنا رہا۔

اس قسم کی دروغ گوئی اور بہتان طرازی پر صرف وہی لوگ یقین کر سکتے ہیں جو شیعوں سے نفرت کرتے ہوں اور جو اسلامی جمہوریہ ایران کے خلاف سامراج کی حمایت پر آمادہ ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی ایران وہ واحد اسلامی ملک ہے جو پچھلے ۴۵ سال سے امریکی

سامراجیت کا نہایت نامساعد حالات میں مقابلہ کر رہا ہے اور غزہ کے حالیہ جہاد میں بھی جن غیر فلسطینیوں نے قربانیاں دیں ان میں ایران اور اس کے شیعہ حلیف، حزب اللہ اور انصار اللہ، ہی تھے۔ انقلاب اسلامی کے وقت سے لے کر آج تک ایران فلسطینیوں کا سب سے بڑا حلیف رہا ہے۔ ایسے ملک کو امریکا کا درپردہ حلیف کہنا جس پر حملہ آور ہونے کی امریکا مستقل (مثلاً مارچ ۲۰۲۵) دھمکیاں دیتا رہتا ہے، بہتان طرازی نہیں تو اور کیا ہے؟

شرم تم کو مگر نہیں آتی

عراق پر امریکا اور یمن کی اسلامی حکومت پر سعودی عرب اور اس کے حواری حملہ آور ہوئے۔ خلیجی جنگ میں ایران کا کوئی کردار نہیں۔ یمن کی اسلامی حکومت کی حمایت ایران نے کی اور یمنی اسلامی حکومت بھی فلسطینی جہاد میں اپنی استعداد سے بڑھ کر جانی اور مالی قربانیاں دے رہی ہے۔ کیا یہ بھی شیعت پھیلانے کی ایک کوشش ہے۔ کل جب اردن، لبنان، سعودی عرب اور عرب امارات امریکی گٹھ جوڑ کے ذریعے فلسطینی مسلمانوں کی پیٹھ میں خنجر گھونپیں گے تو ایران اور یمن اس کی مزاحمت کریں گے۔ کیا اس کو بھی ہم شیعت پھیلانے کی ایک کوشش سمجھیں!

حقیقت یہ ہے کہ ایرانی شیعت کا جو تصور قوم نے اور ہمارے سامراجی آقاؤں نے تعمیر کیا ہے اس کا کوئی وجود نہیں۔ ایرانی خارجہ پالیسی کی کسی ایک سرکاری یا غیر سرکاری دستاویز سے اس کا اشارہ نہیں ملتا کہ اسکی خارجہ پالیسی کا مقصد شیعت کا پھیلاؤ ہے۔ ایران نے شام کی حمایت اس بنیاد پر نہیں کی کہ وہ شیعت کے پھیلاؤ کا ایک ذریعہ بنے۔ بعثی کافر دہریہ تھے جنہوں نے ایک خالصتاً کافر دہریہ حکومت قائم کی جس کا کسی قسم کی شیعت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ مظلومین اس وجہ سے تعذیب کا شکار نہ تھے کہ وہ سنی تھے بلکہ اس وجہ سے کہ وہ بعث کے مخالف تھے۔ بعث پارٹی کے کئی عہدے دار سنی تھے اور پورے بعثی دور میں مراعات یافتہ رہے۔ لیکن پورے دور میں بعثی حکومت سامراج مخالف رہی اور اس نے روس اور ایران کی مدد سے حزب اللہ کو رسد کی ترسیل ممکن بنائی۔ روس، ایران اور شام نے

سامراج مخالف اتحاد قائم کیا جس کا شیعت کے علاقائی پھیلاؤ سے کوئی تعلق نہ تھا۔

اسلامی جمہوریہ ایران کے پہلے وزیر اعظم امام مہدی بازرگان رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے "لا شیعہ، لا سنیہ، انقلاب اسلامیہ"۔ یہ بات ان معنوں میں درست نہیں کہ اسلامی ریاست کسی متعین فقہ کی پابند نہیں ہوتی۔ امارت اسلامیہ افغانستان میں فقہ حنفی اور اسلامی جمہوریہ ایران میں فقہ جعفری نافذ ہے۔ لیکن یہ بات ان معنوں میں درست ہے کہ مختلف فقہوں کے نظم اجتماعی کے احکامات ایک دوسرے کے اتنے قریب ہیں کہ ایک حنفی فقہ جعفری کی ریاستی بالادستی کے باوجود اپنی نجی زندگی میں فقہ حنفی کی تابعداری میں کوئی دقت محسوس نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ کسی سنی عالم نے ایران میں فقہ جعفری کی تنفیذ پر اعتراض نہیں کیا۔ نہ کسی شیعہ عالم نے افغانستان میں فقہ حنفی کی تنفیذ پر اعتراض کیا۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں اسلامی ممالک (ایران اور افغانستان) میں مثالی امن قائم ہے اور ایرانی سنی اپنے آپ کو حکومت اسلامی کا پرجوش حامی گردانتے ہیں۔ اسلامی ریاست میں فرقہ وارانہ عصبیت خود بخود تحلیل ہوتی رہتی ہے۔ مذہب اور مسلک ایک سماجی قوت بن جاتے ہیں اور عوام میں محبت اور اخوت کے جذبات فروغ پاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایران اور افغانستان ایک دوسرے کے قریب آرہے ہیں۔ مارچ ۲۰۲۵ء میں ایرانی وزیر خارجہ کے افغان دورے سے امید کی جاسکتی ہے کہ ایران اسلامی امارت افغانستان کو عنقریب تسلیم کرلے گا۔ ہیئت تحریر الشام کے رہنما بھی اس ماہ ایران سے روابط قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان شاء اللہ اسلامی حکومت ایران، حزب اللہ اور شام کے درمیان دیرپا تعاون کی راہ ہموار کرے گی جو سامراج کی شکست اور جہاد فلسطین کی فتح کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔

عمران خان کی مخالفت کی ضرورت—اسلامی انقلابی موقف

جاوید اکبر انصاری

مجھے البرہان کا شمارہ بہت تاخیر سے ملتا ہے۔ مثلاً جنوری ۲۰۲۵ کا شمارہ ۳ مارچ کو ملا اور دسمبر ۲۰۲۴، فروری ۲۰۲۵ اور مارچ ۲۰۲۵ کے شمارے ابھی (۵ مارچ) تک موصول نہیں ہوئے۔

جنوری ۲۰۲۵ کے البرہان کے صفحہ ۶ اور ۷ پر ہمارے مضمون "تحریک انصاف کی مزاحمت" شائع شدہ "اسلامی انقلاب" جنوری ۲۰۲۵ء صفحات ۸۵ تا ۹۴، کے خلاصے کے طور پر ایک نوٹ دیا گیا ہے جس میں عمران خان سے سیاسی تعاون کی وکالت کی گئی ہے۔ ہم ۲۰۱۱ سے لے کر آج تک اسلامی جماعتوں اور تحریک انصاف کے درمیان ہر قسم کے اشتراک عمل کی مخالفت کرتے رہے ہیں۔

بلاشبہ مخلصین دین کا سواد اعظم (جس کا البرہان ایک معتبر ترجمان ہے) اپنے دل میں عمران خان کے لیے ایک نرم گوشتہ رکھتا ہے اور گو کہ تحریک انصاف مخلصین دین کی جماعت نہیں اس میں شامل مخلصین دین ملک کی دوسری اسلامی جماعتوں کے کارکنوں سے کہیں زیادہ ہیں۔ تحریک انصاف میں پرورش پانے والی دہریت نوازی (secular orientation) اس میں شامل مخلصین دین کو برہم نہیں کرتی اور اس کے نتیجے میں ان میں معاشرتی سیکولرائزیشن برداشت کرنے کی صلاحیت بڑھتی جاتی ہے۔ سیکولرائزیشن کو فروغ دینے والا یہ سیاسی عمل مصر اور عراق اور شام میں جاری رہا اور اس ہی وجہ سے ہم ۲۰۱۱ سے عمران خان کو جمال عبد الناصر کا وارث قرار دیتے آئے ہیں۔

مخلصین دین کی صفوں میں اسلامی انقلابی آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں اور ہم اپنے اس موقف کو مخلصین دین کے حلقوں میں واضح کرنے میں ناکام رہے ہیں (گو کہ اس کے کچھ نہ کچھ اثرات جمعیت علمائے اسلام اور تحریک لبیک میں نظر آتے ہیں)۔ اس نوٹ کے ذریعہ میں عمران خان کی مخالفت کی اسلامی توجیہ پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

اسلامی انقلابی عمران خان کی مخالفت کیوں کرتے ہیں

۱۔ عمران خان ایک سرمایہ دار ہے۔ سرمایہ دار وہ شخص ہوتا ہے جو نظاماتی عمل (انفرادی، معاشرتی، ریاستی) کا وجہ الوجود بڑھوتری برائے بڑھوتری کو گردانتا ہے۔ عمران خان سرمایہ دارانہ تعقل پر ایمان رکھتا ہے اور سرمایہ دارانہ عدل کے فروغ کے لیے سرمایہ دارانہ ریاستی عمل کو بنیادی ذریعہ تصور کرتا ہے۔ اس نے اپنے دور اقتدار میں جو ریاستی پالیسیاں اختیار کیں وہ تمام کی تمام نیولبرل سرمایہ دارانہ پالیسیاں تھیں۔ اس کا تصورِ ریاستِ مدینہ خالصتاً سوشل ڈیموکریٹک ہے۔ وہ سرمایہ دارانہ نظام کو مستحکم کرنے کی خواہش رکھتا ہے۔ اس کے انہدام کو پسند نہیں کرتا۔

اسلامی انقلابی سرمایہ دارانہ نظام کے مکمل انہدام کے بغیر تحفظ دین اور غلبۂ دین کو ناممکن تصور کرتے ہیں۔ ہم سرمایہ دارانہ نظاماتی تضادات کو مہمیز دینا چاہتے ہیں انہیں رفع کرنا نہیں چاہتے۔

۲۔ عمران خان مفاد پرست اور خود پرست شخص megalomaniac ہے۔ اس کی نظریاتی وابستگیاں ابن الوقتی اور مفاداتی ہوتی ہیں۔ وہ بھٹو کی طرح نظریات کو ذاتی اقتدار کے حصول کے لیے اختیار کرتا ہے اور اس ضمن میں ہر طرح کی کرپشن کو برداشت کرنے پر راضی نظر آتا ہے۔ اس کے دور اقتدار میں ملک میں نظاماتی، شعبہ جاتی اور انفرادی کرپشن میں اضافہ ہوا۔ اس کا ذاتی طرزِ زندگی بھٹو و شریف خاندان کے طرزِ زندگی سے مماثل ہے جس کا امام عالمگیر، سید بادشاہ اور فقیر ایپی (رحمہم اللہ اجمعین) کے طرزِ حیات سے کوئی تعلق نہیں۔

پھر اس نے اپنے دور اقتدار میں جو خارجہ پالیسی اختیار کی اس میں اور مسلم لیگ، پیپلز پارٹی اور فوجی حکومتوں کی خارجہ پالیسیوں میں کوئی جوہری فرق نہیں تھا۔ اس نے آئی ایم ایف سے ۲۰۱۹ تا ۲۰۲۳ کئے گئے ای ایف ایف معاہدے کی تنفیذ کی اور ان معاہدوں کی مشاورت میں شریک رہا۔ عمران خان نے اگر نئی حکومت قائم کی تو وہ یقیناً آئی ایم ایف کی زیر دست

حکومت ہو گی جو لبرلائیزیشن اور نجکاری کی پالیسیوں کو جاری رکھے گی۔ بیرونی قرضہ جات پر اس حکومت کا انحصار کم نہ ہو گا اور یہ ایک خالصتاً سرمایہ دارانہ حکومت ہو گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تحریک انصاف مسلم لیگ کی طرح ایک مسلم قوم پرست جماعت ہے اور مسلم قوم پرستی ایک خالصتاً سرمایہ دارانہ نظریہ اور منہج علمیت ہے۔

جناح صاحب اور ان کے حواریوں نے ۱۹۳۷ کے انتخابات ہارنے کے بعد باقاعدہ ملک گیر مہم چلا کر مخلصین دین کو یہ دھوکا دیا کہ ملک میں مسلم قوم پرستانہ بیانیے کی بنیاد پر جو ریاست قائم ہو گی وہ ایک اسلامی ریاست ہو گی۔ اس دھوکا دہی کو سب سے پہلے حضرت امیر شریعت اور حضرت انور شاہ کاشمیری رحمہما اللہ نے طشت از بام کیا اور اس فکر کی حمایت میں مولانا مودودی نے ۱۹۴۰ کی دہائی میں مسلم قوم پرستی کے خلاف نقد مرتب فرمایا۔ لیکن مخلصین دین کا سواد اعظم اس فریب کا شکار ہو گیا اور تحریک پاکستان کے سب سے مخلص اور سرفروش کارکن مخلصین دین کی صفوں ہی سے آئے۔

آج پاکستان کو قائم ہوئے ۷۸ سال ہو چکے ہیں اور یہ بالکل واضح ہو چکا ہے کہ یہاں ایک خالصتاً دہریہ نیوکالونیل ریاستی نظام قائم ہے جس میں مخلصین دین روز بروز کمزور اور بے بس بنائے جا رہے ہیں اور جس کے ریاستی ادارتی ڈھانچے کی کارفرمائی کا تعلق خلافت راشدہ سے تو درکنار مغل سلطنت کی ادارتی صف بندی تک سے نہیں ہے۔ ہمارے کسی سیاسی امام (امام ماوردی، امام ابو یعلی، امام ابن خلدون اور شاہ ولی اللہ) نے مسلم اکثریت کے وجود کو غلبۂ ریاست اسلامی کے لیے کافی تصور نہیں فرمایا۔

لیکن مخلصین دین اور ان کی جماعتیں مسلم قوم پرستی پر بھروسا کرتی ہیں اور اس کو قیام ریاست اسلامی کی طرف ایک ضروری پیش رفت تصور کرتی ہیں۔ قلندر لاہوری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا تھا:

اس دور میں مے اور ہے، جام اور ہے جم اور
ساقی نے بِنا کی روشِ لُطف و ستم اور

مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے، وہ مذہب کا کفن ہے
یہ بُت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے
غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبَوی ہے
بازو ترا توحید کی قوّت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے، تُو مصطفوی ہے
نظّارۂ دیرینہ زمانے کو دِکھا دے
اے مصطفَوی خاک میں اس بُت کو ملا دے!

ہم اسلامی انقلابی ہیں اور ہمیں اس بات کا احساس ہے کہ موجودہ حالات میں ہمارا سب سے اہم نظریاتی حریف مسلم قوم پرستی اور اس کی جماعتیں ہیں۔ مسلم قوم پرست جماعتیں اسلام دشمن جماعتیں نہیں لیکن غلبۂ دین کی فطری مخالف جماعتیں ہیں کیونکہ مسلم قوم پرست سرمایہ دارانہ تحکم کے ماتحت رہنے اور اسلامیت کے اظہار کو ذاتی زندگی تک محدود رکھنے کی داعی ہیں۔ ہم سرمایہ دارانہ نظم اقتدار میں شریک ہونے کی کوشش نہیں کر رہے۔ اس نظام اقتدار کی دائمی مزاحمتی مخالفت مرتب کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ہدایت وارشاد

معلم اولین و آخرین ﷺ کی تعلیمات... دین اکمل واتم

حضرت مولاناڈاکٹر حکیم عبدالحی خلیفہ مجاز حضرت تھانویؒ

﴿يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْأُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ [الجمعة:۱-۲]

ترجمہ:”سب چیزیں جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہیں (قالاً و حالاً) اللہ کی پاکی بیان کرتی ہیں جو کہ بادشاہ ہے (عیبوں سے) پاک ہے۔ زبردست ہے حکمت والا ہے، وہی ہے جس نے (عرب کے) ناخواندہ لوگوں میں انہی (کی قوم) میں سے (یعنی عرب میں سے) ایک پیغمبر بھیجا جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان کو (عقائد باطلہ واخلاق ذمیمہ سے) پاک کرتے ہیں اور ان کو کتاب اور دانشمندی کی باتیں سکھلاتے ہیں اور یہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔(بیان القرآن)

اسلام ایمان اور احسان

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم ایک دن رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے (اس وقت حضور اکرم ﷺ صحابہ کے ایک بڑے مجمع سے خطاب فرمارہے تھے) کہ اچانک ایک شخص سامنے سے نمودار ہوا جس کے کپڑے نہایت سفید اور بال بہت ہی زیادہ سیاہ تھے اور اس شخص پر سفر کا کوئی اثر بھی معلوم نہ ہوتا تھا (جس سے خیال ہوتا کہ یہ کوئی بیرونی شخص نہیں ہے) اور اسی کے ساتھ یہ بات بھی تھی کہ ہم میں سے کوئی شخص اس نووارد کو پہچانتا نہ تھا جس سے خیال ہوتا کہ یہ کوئی باہر کا آدمی ہے، تو یہ شخص حاضرین کے حلقہ میں سے ہوتا ہوا آیا، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے آکر دوزانو

اس طرح بیٹھ گیا کہ اپنے گھٹنے آنحضرت ﷺ کے گھٹنوں سے ملا دیے اور اپنے ہاتھ حضور ﷺ کے زانوؤں پر رکھ دیے اور کہا: اے محمد ﷺ مجھے بتلایئے کہ اسلام کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

"اسلام یہ ہے (یعنی اس کے ارکان یہ ہیں کہ دل و زبان سے) تم یہ شہادت ادا کرو کہ اللہ کے سوا کوئی الہ (کوئی ذات عبادت و بندگی کے لائق) نہیں اور محمد ﷺ اس کے رسول ہیں اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور ماہِ رمضان کے روزے رکھو اور حج بیت اللہ کی تم استطاعت رکھتے ہو تو حج کرو"۔

اس نو وارد سائل نے آپ ﷺ کا یہ جواب سن کر کہا آپ ﷺ نے سچ کہا۔ راویِ حدیث حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم کو اس پر تعجب ہوا کہ یہ شخص پوچھتا بھی ہے اور پھر خود تصدیق و تصویب بھی کرتا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس شخص نے عرض کیا اب مجھے یہ بتلایئے کہ ایمان کیا ہے؟

آپ ﷺ نے فرمایا "ایمان یہ ہے کہ تم اللہ کو اور اس کے فرشتوں کو اور اس کے رسولوں اور اس کی کتابوں کو اور یومِ آخر یعنی روزِ قیامت کو حق جانو اور ہر خیر و شر کی تقدیر کو بھی حق جانو اور حق مانو"۔ (یعنی سن کر بھی) اس نے کہا آپ ﷺ نے سچ کہا۔

اس کے بعد اس شخص نے عرض کیا کہ مجھے بتلایئے احسان کیا ہے؟

آپ ﷺ نے فرمایا "احسان یہ ہے کہ اللہ کی عبادت و بندگی تم اس طرح کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو اگرچہ تم اس کو نہیں دیکھتے ہو لیکن وہ تو تم کو دیکھتا ہی ہے"۔

پھر اس شخص نے عرض کیا مجھے قیامت کی بات بتلایئے (کہ کب واقع ہو گی؟)

آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس سے یہ سوال کیا جا رہا ہے وہ اس کو سوال کرنے والے سے زیادہ نہیں جانتا۔

پھر اس نے عرض کیا تو پھر مجھے اس کی کچھ نشانیاں ہی بتلا دیجیے۔

آپ ﷺ نے فرمایا (اس کی ایک نشانی تو یہ ہے کہ) لونڈی اپنے آقا اور مالک کو جنے گی اور

(دوسری نشانی یہ ہے کہ) تم دیکھو گے کہ جن کے پاؤں میں جوتا اور تن پر کپڑا نہیں ہے اور جو تہی دست اور بکریاں چرانے والے ہیں وہ بڑی بڑی عمارتیں بنائیں گے اور اس میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کریں گے"۔

حضرت عمر ﷺ کہتے ہیں کہ یہ باتیں کر کے وہ نوارد شخص چلا گیا پھر مجھے کچھ عرصہ گزر گیا تو مجھ سے حضور ﷺ نے فرمایا کہ اے عمر! تمہیں پتہ ہے کہ وہ سوال کرنے والا شخص کون تھا؟ میں نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ﷺ ہی زیادہ جاننے والے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ جبریل علیہ السلام تھے، تمہاری اس مجلس میں اس لیے آئے تھے کہ تم لوگوں کو تمہارا دین سکھائیں۔ (صحیحین، معارف الحدیث)

ایمان دین کی تمام باتوں کی تصدیق کرنے کا نام ہے

ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اکرم نے فرمایا دین پانچ چیزوں کا مجموعہ ہے (جو سب ضروری ہیں ان میں سے کوئی بھی چیز دوسرے کے بغیر بایں معنی مقبول نہیں کہ دوزخ سے کامل نجات دلا سکے) اس بات کی شہادت دینا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور (حضرت) محمد اس کے بندے اور رسول ہیں اور اللہ تعالیٰ پر اور اس کے فرشتوں، کتابوں، اس کے رسولوں اور جنت و دوزخ پر یقین رکھنا اور اس پر کہ مرنے کے بعد پھر (حساب و کتاب کے لیے) جی اٹھنا ہے، یہ ایک بات ہوئی اور پانچ نمازیں اسلام کا ستون ہیں، اللہ تعالیٰ نماز کے بغیر ایمان بھی قبول نہیں کرے گا۔

زکوٰۃ گناہوں کا کفارہ ہے، زکوٰۃ کے بغیر اللہ تعالیٰ ایمان اور نماز بھی قبول نہیں کرے گا پھر جس نے یہ ارکان ادا کر لیے اور رمضان شریف کا مہینہ آگیا اور کسی عذر کے بغیر جان بوجھ کر اس میں روزے نہ رکھے تو اللہ تعالیٰ نہ اس کا ایمان قبول کرے گا اور نہ نماز و زکوٰۃ اور جس شخص نے یہ چاروں رکن ادا کر لیے اس کے بعد حج کرنے کی بھی وسعت ہوئی پھر اس نے نہ خود حج کیا اور نہ اس کے بعد کسی دوسرے عزیز نے حج اس کی طرف سے حج کیا تو اس کا ایمان، نماز، زکوٰۃ اور روزے کچھ قبول نہیں، قبول نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کسی رکن اسلام میں

کو تاہی ہونے سے بقیہ اعمال دوزخ سے فوری نجات دلانے کے لیے کافی نہ ہوں گے۔(الحلیہ، ترجمان السنۃ)

اسلام کامل

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسلام یہ ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ، باضابطہ نماز پڑھو، زکوٰۃ ادا کرو، رمضان کے روزے رکھا کرو، بیت اللہ کا حج کرو، بھلی بات بتایا کرو، بری بات سے روکا کرو (گھر میں آکر) گھر والوں کو سلام کیا کرو، جو شخص ان باتوں میں سے کوئی بات نہیں کرتا تو اسلام کا ایک جزو ناقص کرتا ہے اور جو ان سب ہی کو چھوڑ دے اس نے تو اسلام سے پشت ہی پھیر لی۔(حاکم، ترجمان السنۃ)

حضرت طلحہ بن عبید اللہ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ ایک شخص جو علاقہ نجد کا رہنے والا تھا اور اس کے سر کے بال بکھرے ہوئے تھے (کچھ کہتا ہوا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آیا، ہم اس کی بھنبھناہٹ کو تو سنتے تھے مگر آواز صاف نہ ہونے کی وجہ سے (اور شاید فاصلہ کی زیادتی بھی اس کی وجہ ہو) ہم اس کی بات کو سمجھ نہیں رہے تھے، یہاں تک کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب آگیا۔

اب وہ سوال کرتا ہے اسلام کے بارے میں (یعنی اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ "مجھے اسلام کے وہ خاص احکام بتلایئے جن پر عمل کرنا بحیثیت مسلمان میرے لیے اور ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پانچ نمازیں ہیں دن رات میں (جو فرض کی گئی ہیں اور اسلام میں یہ سب سے اہم فریضہ ہے)۔

اس نے عرض کیا کہ کیا ان کے علاوہ اور کوئی نماز بھی میرے لیے لازم ہو گی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "نہیں" (فرض تو بس یہی پانچ نمازیں ہیں) مگر تمہیں حق ہے کہ اپنی طرف سے اور اپنے دل کی خوشی سے (ان پانچ فرض نمازوں کے علاوہ) اور بھی زائد نمازیں

پڑھو (اور مزید ثواب حاصل کرو)۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور سال میں پورے ماہ رمضان کے روزے فرض کیے گئے ہیں (اور یہ اسلام کا دوسرا عمومی فریضہ ہے)۔

اس نے عرض کیا کیا رمضان کے علاوہ اور کوئی روزے بھی میرے لیے لازم ہوں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں (فرض تو بس رمضان ہی کے روزے ہیں) مگر تمہیں حق ہے کہ اپنے دل کی خوشی سے تم اور نفلی روزے رکھو (اور اللہ تعالیٰ کا مزید قرب اور ثواب حاصل کرو)۔

راوی کہتے ہیں کہ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص سے فریضہ زکوٰۃ کا بھی ذکر فرمایا، اس پر بھی اس نے یہی کہا کہ:

"کیا اس زکوٰۃ کے علاوہ کوئی اور صدقہ ادا کرنا بھی میرے لیے ضروری ہو گا؟ آپ نے فرمایا نہیں (فرض تو بس زکوٰۃ ہی ہے) مگر تمہیں حق ہے کہ اپنے دل کی خوشی سے تم نفلی صدقہ دو"۔

راوی حدیث طلحہ بن عبید اللہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد وہ سوال کرنے والا شخص لوٹ گیا، اور وہ کہتا جا رہا تھا کہ (مجھے جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا ہے) میں اس میں (اپنی طرف سے) کوئی زیادتی یا کمی نہیں کروں گا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اس کی یہ بات سن کر) فرمایا۔ "فلاح پالی اس نے اگر یہ سچا ہے"۔ (بخاری مسلم معارف الحدیث)

اللہ تعالیٰ سے حسن ظن

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اچھا گمان رکھنا اللہ تعالیٰ کے ساتھ جملہ بہترین عبادات کے ہے (یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسن ظن بھی عبادات میں داخل ہے)۔ (مسند احمد، ابو داؤد مشکوٰۃ)

علامت ایمان

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس کو اپنے ماں باپ، اپنی اولاد اور سب لوگوں سے زیادہ میری محبت نہ ہو۔ (معارف الحدیث، بخاری و مسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایمان کی ستر سے بھی کچھ اوپر شاخیں ہیں ان میں سب سے اعلیٰ و افضل تو لا الہ الا اللہ کا قائل ہونا یعنی توحید کی شہادت دینا ہے اور ان میں ادنیٰ درجہ کی چیز، اذیت اور تکلیف دینے والی چیزوں کا راستہ سے ہٹانا ہے اور حیاء ایمان کی ایک اہم شاخ ہے۔ (معارف الحدیث، بخاری و مسلم)

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ ایمان کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم کو اپنے اچھے عمل سے مسرت ہو اور برے کام سے رنج اور قلق ہو تو تم مومن ہو۔ (معارف الحدیث، مسند احمد)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حیاء اور شرم ایمان سے پیدا ہوتی ہے اور ایمان کا نتیجہ جنت ہے اور بے حیائی اور فحش کلامی درشتی فطرت سے پیدا ہوتی ہے اور اس کا نتیجہ دوزخ ہے۔ (مسند احمد، ترمذی)

ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حیاء اور ایمان دونوں ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں، جب ان میں سے ایک اٹھا لیا جاتا ہے تو دوسرا بھی اٹھا لیا جاتا ہے۔ (معارف الحدیث)

اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں یہ مضمون اس طرح ہے کہ جب ان میں سے ایک چھین لیا جاتا ہے تو دوسرا بھی اس کے پیچھے روانہ ہو جاتا ہے۔ (شعب الایمان، ترجمان السنۃ)

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کوئی ہے ایسا شخص جو ان باتوں پر خود عمل کرے یا کم از کم ان لوگوں ہی کو بتا دے جو ان پر عمل کریں،

میں بولا یا رسول اللہ میں حاضر ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑا اور یہ پانچ باتیں شمار فرمائیں:

۱۔ فرمایا، حرام باتوں سے دور رہنا، بڑے عبادت گزار بندوں میں شمار ہو گا۔

۲۔ اللہ تعالیٰ جو تمہاری تقدیر میں لکھ چکا ہے اس پر راضی رہنا، بڑے نیاز بندوں میں شمار ہو جاؤ گے۔

۳۔ اپنے پڑوسی سے اچھا سلوک کرتے رہنا، مومن بن جاؤ گے۔

۴۔ جو بات اپنے لیے چاہتے ہو وہی دوسروں کے لیے پسند کرنا، کامل مسلمان بن جاؤ گے۔

۵۔ اور بہت قہقہہ نہ لگانا کیونکہ یہ دل کو مردہ بنا دیتا ہے۔ (مسند احمد، ترمذی، ترجمان السنۃ)

ابو شریح خزاعی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "قسم ہے اللہ تعالیٰ کی وہ مومن نہیں، قسم ہے اللہ تعالیٰ کی وہ مومن نہیں، قسم ہے اللہ تعالیٰ کی وہ مومن نہیں"۔ میں نے کہا یا رسول اللہ کون مومن نہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ آدمی جس کے پڑوسی اس کی شرارتوں اور آفتوں سے خائف رہتے ہوں"۔ (بخاری، معارف الحدیث)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "تم جنت میں نہیں جا سکتے جب تک کہ صاحب ایمان نہ ہو جاؤ اور تم پورے مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ تم میں باہمی محبت نہ ہو، کیا میں تم کو ایک ایسی بات نہ بتلا دوں کہ اگر تم اس پر عمل کرنے لگو تو تم میں باہمی محبت پیدا ہو جائے اور وہ بات یہ ہے کہ تم اپنے درمیان سلام کا رواج پھیلاؤ اور اس کو عام کرو"۔ (مسلم، معارف الحدیث)

ایمان اور اسلام کا خلاصہ

حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دین نام ہے "خلوص اور وفاداری کا"۔ ہم نے عرض کیا کہ کس کے ساتھ خلوص اور وفاداری؟ ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ کے ساتھ، اللہ تعالیٰ کی کتاب کے ساتھ، اللہ تعالیٰ کے رسول کے ساتھ،

مسلمانوں کے سرداروں اور پیشواؤں کے ساتھ اور ان کے عوام کے ساتھ۔(معارف الحدیث، مسلم)

ایمان کا آخری درجہ

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کوئی تم میں سے کوئی بری اور خلاف شرع بات دیکھے تو لازم ہے کہ اگر طاقت رکھتا ہو تو اپنے ہاتھ سے (یعنی زورِ قوت سے) اس کو بدلنے کی (یعنی درست کرنے کی) کوشش کرے اور اگر اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو پھر اپنی زبان ہی سے اس کو بدلنے کی کوشش کرے اور اگر اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو اپنے دل ہی سے برا سمجھے اور یہ ایمان کا ضعیف ترین درجہ ہے۔ (مسلم، معارف الحدیث)

اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ سے محبت

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین چیزیں ایسی ہیں کہ وہ جس شخص میں ہوں گی اس کو ان کی وجہ سے ایمان کی حلاوت نصیب ہو گی۔

۱۔ ایک وہ شخص جس کے نزدیک اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم سب ماسوا سے زیادہ محبوب ہوں، یعنی جتنی محبت اس کو اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوتی کسی سے نہ ہو۔

۲۔ اور ایک وہ شخص جس کو کسی بندہ سے دنیوی محبت ہو اور محض اللہ ہی کے لیے ہو (یعنی کسی دنیوی غرض سے نہ ہو محض اس وجہ سے محبت ہو کہ وہ شخص اللہ والا ہے)

۳۔ اور ایک وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے کفر سے بچا لیا ہو (خواہ پہلے سے ہی سے بچا رہا ہو، خواہ کفر سے توبہ کر لی اور بچ گیا) اور اس (بچا لینے) کے بعد وہ کفر کی طرف آنے کو اس قدر ناپسند کرتا ہے جیسے آگ میں ڈالے جانے کو ناپسند کرتا ہے (روایت کیا اس کو بخاری و مسلم نے)۔(حیاۃ المسلمین)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل ایمان کے متعلق سوال کیا (یعنی پوچھا کہ ایمان کا اعلیٰ اور افضل درجہ کیا ہے؟ اور وہ کون سے اعمال و اخلاق ہیں جن کے ذریعہ اس کو حاصل کیا جا سکتا ہے)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا یہ کہ بس اللہ تعالیٰ ہی کے لیے کسی سے تمہاری محبت ہو اور اللہ تعالیٰ ہی کے واسطے بغض و عداوت ہو (یعنی دوستی اور دشمنی جس سے بھی ہو صرف اللہ تعالیٰ ہی کے واسطے ہو) اور دوسرے یہ کہ اپنی زبان کو تم اللہ تعالیٰ کی یاد میں لگائے رکھو۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، اَور کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور یہ کہ دوسرے لوگوں کے لیے بھی وہی چاہو اور وہی پسند کرو جو اپنے لیے پسند کرتے ہو اور چاہتے ہو اور ان کے لیے ان چیزوں کو بھی ناپسند کرو جو اپنے لیے ناپسند کرتے ہو۔ (بخاری و مسلم، مسند احمد، معارف الحدیث)

محبت ذریعہ قرب و معیت

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیا فرماتے ہیں ایسے شخص کے بارے میں جس کو ایک جماعت سے محبت ہے لیکن وہ ان کے ساتھ نہیں ہو سکا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو آدمی جس سے محبت رکھتا ہے اس کے ساتھ ہے (یا یہ کہ آخرت میں اس کے ساتھ کر دیا جائے گا)۔ (صحیح بخاری، مسلم، معارف الحدیث)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کب آئے گی! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وائے بر حال تو (قیامت کے وقت اور اس کے آنے کی خاص گھڑی دریافت کرنا چاہتا ہے، بتلا) تو نے اس کے لیے کیا تیاری کی ہے؟ اس نے عرض کیا میں نے اس کے لیے کوئی خاص تیاری تو نہیں کی (جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ذکر کرنے کے لائق اور بھروسہ کے قابل ہو) البتہ توفیق الٰہی سے مجھے یہ ضرور نصیب ہے کہ) مجھے محبت ہے اللہ سے اور اس

کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تجھ کو جس سے محبت ہے تو انہی کے ساتھ ہے اور تجھ کو ان کی معیت نصیب ہو گی۔

حدیث کے راوی حضرت انس رضی اللہ عنہ اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ میں نے نہیں دیکھا کہ مسلمانوں کو (یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کو) کہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد ان کو کسی چیز سے اتنی خوشی ہوئی ہو جتنی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بشارت سے ہوئی۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم، معارف الحدیث)

ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اپنی بیوی، اپنی اولاد اور اپنی جان سے بھی زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے اور میرا حال یہ ہے کہ میں اپنے گھر پر ہوتا ہوں اور حضور مجھے یاد آجاتے ہیں تو اس وقت تک مجھے صبر اور قرار نہیں آتا، جب تک حاضر خدمت ہو کر ایک نظر دیکھ نہ لوں اور جب میں اپنے مرنے کا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا خیال کرتا ہوں تو میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ وفات کے بعد تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم جنت میں پہنچ کر انبیاء علیہم السلام کے بلند مقام پر پہنچا دیے جائیں گے اور میں اگر اللہ کی رحمت سے جنت میں بھی گیا تو میری رسائی اس مقام عالی تک نہ ہو سکے گی۔ اس لیے آخرت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار سے بظاہر محرومی ہی رہے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کی اس بات کا کوئی جواب اپنی طرف سے نہیں دیا، یہاں تک کہ سورہ نساء کی یہ آیت نازل ہوئی:

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَأُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِيْنَ وَحَسُنَ أُولٰٓئِكَ رَفِيقًا (سورۃ نساء:٦٩)

ترجمہ: "اور جو لوگ فرمانبرداری کریں اللہ کی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پس وہ اللہ کے ان خاص بندوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ کا خاص انعام ہے یعنی انبیا، صدیقین، شہداء اور صالحین اور یہ سب بڑے ہی اچھے رفیق

ہیں"۔(طبرانی، معارف الحدیث)

اللہ کے لیے آپس میں میل محبت کرنے والے اللہ کے محبوب ہو جاتے ہیں

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میری محبت واجب ہے ان لوگوں کے لیے جو باہم میری وجہ سے محبت کریں اور میری وجہ سے اور میرے تعلق سے کہیں جڑ کر بیٹھیں اور میری وجہ سے باہم ملاقات کریں اور میری وجہ سے ایک دوسرے سے پر خرچ کریں۔(موطا امام مالک، معارف الحدیث)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کے بندوں میں کچھ ایسے خوش نصیب بھی ہیں جو نبی یا شہید تو نہیں ہیں، لیکن قیامت کے دن بہت سے انبیاء اور شہداء ان کے خاص مقامِ قرب کی وجہ سے ان پر رشک کریں گے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یارسول اللہ ہمیں بتلا دیجیے وہ کون بندے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے بغیر کسی رشتہ اور قرابت کے اور بغیر کسی مالی لین دین کے محض خوشنودیٔ خداوندی کی وجہ سے باہم محبت کی۔ پس قسم ہے خدا کی ان کے چہرے قیامت کے دن نورانی ہوں گے، بلکہ سراسر نور ہوں گے اور وہ نور کے منبروں پر ہوں گے اور عام انسانوں کو جس وقت خوف و ہراس ہو گا اس وقت وہ بے خوف اور مطمئن ہوں گے اور جس وقت عام انسان مبتلائے غم ہوں گے وہ اس وقت بے غم ہوں گے اور اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی:

أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (یونس:۶۲)

ترجمہ: "معلوم ہونا چاہیے کہ جو اللہ کے دوست ہیں اور اس سے خاص تعلق رکھنے والے ہیں ان کو خوف اور غم نہ ہو گا"۔(سنن ابی داؤد، معارف الحدیث)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ مجھ پر واجب ہے کہ میں ان لوگوں سے محبت کروں جو لوگ میری خاطر آپس میں محبت اور دوستی کرتے ہیں اور میرے ذکر کے لیے ایک جگہ جمع ہو کر بیٹھتے ہیں اور میری محبت کے سبب ایک دوسرے سے ملاقات کرتے ہیں اور میری خوشنودی چاہنے کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ نیک سلوک کرتے ہیں۔ (احمد، ترمذی)

ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سے ایک شخص گزرا۔ کچھ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اس شخص سے محض خدا کی خاطر محبت ہے، یہ سن کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا تو کیا تم نے اس شخص کو یہ بات بتادی ہے وہ شخص بولا نہیں۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جاؤ اس پر ظاہر کر دو کہ تم خدا کے لیے اس سے محبت کرتے ہو۔ وہ شخص فوراً اٹھا اور جا کر اس جانے والے سے اپنے جذبات کا اظہار کیا اس کے جواب میں اس نے کہا تجھ سے وہ ذات محبت کرے جس کی خاطر تو مجھ سے محبت کرتا ہے۔ (ترمذی، ابوداؤد)

نیک لوگوں کے پاس بیٹھنا

حضرت ابورزین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا میں تم کو ایسی بات نہ بتلاؤں جس پر اس دین کا (بڑا) مدار ہے جس سے دنیا و آخرت کی بھلائی حاصل کر سکتے ہو، ایک تو ذکر کی مجالس کو مضبوط پکڑ لو (اور دوسرے جب تنہا ہوا کرو جہاں تک ممکن ہو ذکر اللہ کے ساتھ زبان کو متحرک رکھو (اور تیسرے) اللہ تعالیٰ کے لیے محبت رکھو اور اللہ تعالیٰ ہی کے لیے بغض رکھو (بیہقی فی شعب الایمان)

فائدہ: یہ بات تجربہ سے بھی معلوم ہوتی ہے، صحبت نیک جڑ ہے تمام دین کی۔ دین کی حقیقت، دین کی حلاوت، دین کی قوت کے جتنے ذریعے ہیں، سب سے بڑھ کر ذریعہ ان چیزوں کے صحبت نیک ہے۔ (حیاۃ المسلمین)

نظریات و تطبیقات

اصطلاحات کا دھوکا انسانی حقوق کے تناظر میں

مولانا ڈاکٹر حبیب الرحمٰن

مغربی تہذیب نے سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں عالمگیر غلبہ کے بعد زبان و ادب اور لسانی اصطلاحات و تعبیرات کے میدان میں باقی اقوام کی مذہبی، روحانی، تہذیبی، ثقافتی، تاریخی، لسانی اور ادبی شناخت کو مٹانے یا مغلوب کرنے کے لیے تحریفِ لسانی اور اصطلاحات سازی کی ایسی فیکٹری لگا رکھی ہے جس کے نتیجہ میں حق اور باطل، سچ اور جھوٹ، صحیح اور غلط کے مابین امتیاز کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے، الّا یہ کہ ان اصطلاحات کی حقیقت اور ماہیت سے کماحقہ آگاہی حاصل ہو۔

اصطلاحات میں تبدیلی کا مقصد

مغربی تہذیب کا اصل مقابلہ اسلام کے ساتھ ہے کیونکہ مغربی مفکرین اور دانشور اسلام کے سوا کسی دوسری تہذیب کو اپنے مقابلے میں نہیں سمجھتے۔ اس لیے مغربی تہذیبی اقدار اور مغرب کی وضع کردہ اصطلاحات کا سب سے بڑا نشانہ اسلام ہی بنتا ہے۔ ان اصطلاحات کا عمومی اور بے دریغ استعمال کسی اور قوم و ملت کے لیے شاید اتنے نقصان کا باعث نہ ہو کیونکہ مسلمانوں کے ماسوا کسی بھی دوسری قوم کے لیے "الحق" اور ابدی صداقت کا کوئی ابدی اُصول موجود نہیں ہے بلکہ زمان و مکان کے تغیر اور حالات و معاملات کے تقاضوں سے اپنے مذہب کو ہم آہنگ رکھنے کے لیے مستقل تغیر و تبدل بلکہ کتب مقدسہ میں تحریف کرنا اور مذہب کو زمان و مکان سے ہم آہنگ کرنا نہ کہ زمان و مکاں کو مذہب سے ہم آہنگ کرنا آج تمام مذاہبِ عالم اپنی مذہبی و اخلاقی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔ اسی لیے دیگر اقوام کے نزدیک مذہبی اصطلاحات اور تعبیرات کے معانی و مفاہیم میں تبدیلی کوئی بڑا مسئلہ نہیں سمجھا جاتا بلکہ اسے ضرورت کے تحت بجالانا ہی اہم خیال کیا جاتا ہے۔ لہٰذا جن مذاہب میں بذات خود حق و باطل کے ابدی اُصول موجود نہ ہوں اُن کے لیے دائمی و ابدی اصطلاحات جو دائمی و ابدی

تعلیمات و تصورات پر دلالت کرتی ہوں مفقود ہو جایا کرتی ہیں۔ اُن مذاہب کی اصل غرض و غایت یہ نہیں رہتی کہ ان کے پیروکار ان مذاہب کی اصولی اور بنیادی تعلیمات کو اُس کی روح کے ساتھ قبول کرتے ہیں یا نہیں بلکہ اصل غرض و غایت فقط یہ رہ جاتی ہے کہ اُن کے پیروکاروں کی تعداد اگر بڑھ نہ سکے تو کم بھی نہ ہو خواہ اس کے لیے انہیں جدید افکار و نظریات اور اقدار و معاملات کے ساتھ مصالحت (Adjustment) ہی کیوں نہ کرنی پڑ جائے۔

اس تناظر میں بعض مذاہب اپنی اصولی تعلیمات سے اپنے پیروکاروں کی رضامندی کی خاطر دست بردار ہونے کے لیے بھی ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ ہندومت اور عیسائیت ایسے مذاہب ہیں جن میں ترمیم اور تبدیلی کے لیے اہل مذہب کسی بھی حد تک جانے کے لیے تیار ہو سکتے ہیں بشرطیکہ اس کے نتیجہ میں مندر و کلیسا اور پادری و پنڈت کو مالی و مادی منفعت کی کوئی صورت نظر آتی ہو۔ لہٰذا ان دونوں مذاہب سمیت جملہ مذاہب عالم کے لیے لسانی و اصطلاحی تغیرات اور زمانی تعبیرات کے وہ نئے مفاہیم جو اپنی حقیقت کے اعتبار سے مختلف جہاں رکھتے ہوں ان کو اپنے مذہب کا حصہ بنانا یا ان سے اپنے مذہب کی مبادیات میں تبدیلی کرنا کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔

اصطلاحات میں تبدیلی کے نقصانات

ہیومن بینگ کا اپنے نظریات اور نفسانی چاہتوں کے فروغ کے لیے نئی اصطلاحات کا ایجاد کرنا اور دیگر کے حقیقی معانی و مفاہیم اور اطلاقات میں تحریف ناقابل معافی جرم ہے کیونکہ اس کے نتیجہ میں انسان بالآخر رب کا بندہ بننے کے بجائے نفس کا بندہ بن جاتا ہے جس کے نتائج تباہ کن ہوتے ہیں۔ اسے قرآن کریم کی اصطلاح میں فتنہ کہا جائے تو غلط نہیں کیونکہ قرآن کریم نے فتنہ بمعنی آزمائش اور دھوکا دہی کے لیے بھی استعمال کیا ہے۔ یہ لسانی و اصطلاحاتی فتنہ اپنے تباہ کن نتائج کے اعتبار سے قتلِ اُمت و اقوام سے زیادہ سخت فتنہ اس لیے ہے کہ اس کے نتیجہ میں انسان مقدسات کو غیر مقدسات، محرمات کو غیر محرمات، ممنوعات کو مباحات،

جبکہ دوسری طرف سے حلال کو حرام جائز کو ناجائز اور اچھے عمل اور تصور کو بُرے سے بدل دیتا ہے۔ جس کا نتیجہ خود اسلام کی اساسیات اور مبادیات پر مصالحت اور شعائر اسلامی کو ان کے اصل معنی اور مقام سے بدل دینے کا مترادف ہو سکتا جو خود اسلامی علمیت کے لیے ایک ایسی تحدی (Challenge) کی صورت اختیار کر سکتا ہے جس میں بیت اللہ، حرم پاک، قرآن کریم، اذان، نماز، روزہ، زکوۃ، حج، جہاد، اجتہاد سمیت دوسری تمام اصطلاحات تحریف و تبدل سے دوچار ہو سکتی ہیں لہٰذا اسلامی اصطلاحات کا استعمال صرف اس کے اصل موضع و مقام اور معنی و مفہوم میں کیا جانا بہت ضروری ہے۔

اصطلاحات کے بدلنے سے ایک اور خطرناک نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ انسانی معاشروں اور اقوام کی ماہیت قلبی اس طور پر ہو جاتی ہے کہ خلق خدا، بندگی رب یعنی عبدیت کے دائرے سے نکل کر نفس پرستی، طاغوت پرستی، دنیا پرستی اور عیش پرستی کی راہ پر لگ جاتی ہے۔ وحی الٰہی، آسمانی تعلیمات اور صحف سماویہ نے اصطلاحات کو ایک خاص دینی، روحانی، ایمانی و ایقانی تناظر میں بیان کیا ہوتا ہے جس کا مقصد اُن اصطلاحات کے ذریعے بندوں کی بندگی کو قرب الٰہی میں بدل کر انہیں ابدی نعمتوں کا اُمیدوار بنانا ہوتا ہے۔

ہیومن رائٹس اور حقوق العباد میں فرق

اسلام اپنی ابدی تعلیمات کے ساتھ اپنے اصطلاحات کے مفاہیم اور اطلاقات میں بھی ابدیت کا حامل ہے۔ اسی لیے کسی بھی شخص، جماعت، قوم اور تہذیب کو کسی بھی صورت یہ حق نہیں دیا جاسکتا کہ وہ اسلام کے متعین کردہ الہامی اصطلاحات کو اپنے من پسند اور انسانی فہم و ادراک پر مشتمل معنی و مفاہیم یا تعبیر کا جامہ پہنا سکے۔ آج پوری دنیا میں مسلمان ممالک بڑے فخر سے حقوق انسانی کے چارٹر کو حقوق العباد کا مجموعہ یا مترادف سمجھ کر قبول بھی کرتے ہیں اور اُس کی تعریف میں زمین و آسماں کے قلابے بھی ملاتے ہیں حالانکہ حقوق انسانی اور حقوق العباد میں بہت بڑا اصولی فرق ہے۔ بعض لوگ اپنی لاعلمی یا عدم توجہی کے باعث یہاں تک دعویٰ کر بیٹھے ہیں کہ اقوام متحدہ کا عالمی منشور برائے حقوق انسانی (Charter

Last Sermon of Holy شاید خطبہ حجۃ الوداع of Human rights) Prophet ﷺ سے ماخوذ ہے۔ ایسا ہر گز نہیں کیونکہ حقوق کے تناظر میں چند چیزیں آپس میں یقیناً ملتی جلتی ہیں جس سے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ شاید حقوق انسانی اور حقوق العباد میں کوئی فرق نہیں حالانکہ یہ سمجھنا ایک بڑی علمی، فکری اور نظریاتی بلکہ اعتقادی غلطی ہے۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ حقوق العباد بندوں کے دوسرے بندوں کے حوالے سے اُن فرائض اور واجبات کا نام ہے جس کا تعین بندوں نے نہیں کیا بلکہ رب تعالیٰ نے خود یا پھر اپنے نبی آخر الزماں کے ذریعے فرمایا لہٰذا ان حقوق کی حیثیت غیر متبدل اور الہامی ہے جس میں تنسیخ، ترمیم واضافہ کا حق کسی انسان یا ادارے کو ہر گز حاصل نہیں ہے ان حقوق کی حیثیت اسی طرح ہے جس طرح اسلام میں فرائض وعبادات کا مجموعہ غیر متبدل بنیادوں پر قائم ہے۔ انسانوں کا قلیل یا کثیر، بے اختیار یا با اختیار اور کم عقل مند یا بہت زیادہ عقلمند گروہ مل کر بھی اس مجموعے میں رتی برابر تبدیلی نہیں کر سکتا۔ اسی طرح دنیا کی کسی پارلیمینٹ یا عدلیہ کو یہ حق حاصل نہیں ہو سکتا کہ وہ اسلام کے پیش کردہ حقوق العباد کے تصور اور تعلیم کے متبادل کسی اور فلسفہ یا تعلیمات کے مجموعے کو حقوق العباد کے نام سے پیش کرے۔

اسلام تمام انسانوں کے یکساں حقوق کا بالکل بھی قائل نہیں کیونکہ تمام انسان علم، اخلاق، کردار، سیرت، عمل، محنت، عبادت، تقویٰ اور رویوں میں برابر نہیں ہیں اسی لیے اسلام میں حقوق کی ادائیگی کو فرائض کی ادائیگی کے ساتھ مشروط کر دیا گیا ہے۔ مطلق حقوق کا تصور خود انسانی معاشروں میں بھی عملی طور پر ناممکن ہے کیونکہ اپنے ذمہ کے فرائض ادا کیے بغیر باپ اپنے بیٹے کو، ماں اپنی بیٹی کو، استاد اپنے شاگرد کو اور کارخانہ دار اپنے ملازم کو کسی قسم کا حق یا حقوق دینے کا پابند نہیں ہوتا۔ اسی طرح ہر وہ شخص جو اپنا فریضہ تخلیق یعنی عبدیت وبندگی بجا لانے سے انکاری ہو وہ اُن تمام حقوق سے یکسر محروم ہو جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے اُن کی بندگی واطاعت پر رضامندی کی وجہ سے مختص فرمائے ہیں۔ بر سبیل تنزل اس معاملہ کو کسی ملک کے عام شہری اور مجرم شہری کے تناظر میں دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے یعنی

عام شہری جو ملک کے قوانین کا پاسدار اور ریاست کا وفادار ہو اور وہ شخص جو ملکی قوانین کو رد کرنے والا اور ریاست کا غدار ہو شہری ہونے کے اعتبار سے یکساں ہونے کے باوجود حقوق کے لحاظ سے یکساں نہیں ہوتے کیونکہ ایک شہری کے حقوق فرماں بردار شہری کی حیثیت سے اور دوسرے کے باغی اور مجرم شہری کی حیثیت سے تعین کیے جاتے ہیں۔

اسلام میں حقوق العباد کا تعلق حقوق اللہ سے ہے۔ حقوق اللہ کی ادائیگی مقدم اور حقوق العباد کی ادائیگی مؤخر ہے یعنی حقوق العباد کا شعور حقوق اللہ کی ادائیگی کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ محض حقوق انسانی کا نعرہ بظاہر تو بہت ہی خوبصورت نعرہ ہے لیکن اس نعرہ کو حقیقت میں بدلنے کے لیے کوئی اعتقادی و الہامی اساس و بنیاد نہیں ہے۔ حقوق انسانی کے معاملے میں سب سے بڑا ابہام یہ ہے کہ آخر "انسان" کون ہے؟ اور "انسان" کون نہیں ہے؟ کیونکہ اگر روئے زمین پر بسنے والے تمام افراد انسان ہیں تو پھر جنگوں میں غیر مسلح اور غیر جنگجو افراد بشمول بچوں، عورتوں، بوڑھوں، بیماروں، معذوروں اور عام لوگوں کا قتل عام کسی شخص یا ادارے کی طرف سے نہیں بلکہ حقوق انسانی کے سب سے بڑے نام نہاد دعویداروں مغربی ممالک کی طرف سے کیوں کیا جاتا ہے؟ اس کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ مغرب جس انسان اور اُس کے حقوق کی بات کرتا ہے اُس سے مراد ہر شخص نہیں ہوتا بلکہ اس "انسان" سے مراد ہیومن (Human) ہوتا ہے جو اپنی اصل اور حقیقت کے اعتبار سے سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن اللہ کا بندہ اور خدا کے کسی بھی پیغمبر کا پیروکار نہیں ہو سکتا کیونکہ Human جس مذہب کا پیروکار ہوتا ہے وہ Humanism کہلاتا ہے[1]۔ یہ ہیومن (Human) کسی

---

[1] طاغوتی قوتوں کی آسمانی عقیدہ و اعتقاد کے خلاف جنگ کا آغاز سولھویں صدی میں نکولو میکیاولی (۱۴۶۹ء-۱۵۲۷ء) کی ۱۵۱۳ء میں بدنام زمانہ تصنیف 'شہزادہ' (The Prince) سے ہوا کیونکہ آسمانی اقدار کے مقابلے میں 'شہزادہ' مبہم ڈرامائی جنگ کا مرکزی کردار تھا۔ میکیاولی اس مذموم منصوبہ بندی کا خالق تھا جس کو اقبالؒ نے 'مرسلے از شیطان' کے لقب سے یاد کیا، یعنی 'شیطان کا بھیجا ہوا پیغمبر'۔ میکیاولی نے جھوٹ، تحریف، دھوکا دہی اور بد دیانتی کے سہارے ہیومنزم (Humanism) یا 'اکرام انسانیت' کے فلسفہ کو

بھی الہامی مذہب، الہامی عقائد و تصورات اور نظریات کے برعکس انسانی پیش کردہ فکر و فلسفہ اور قوانین و نظریات کا پیروکار ہوتا ہے۔ مغربی مفکر "کانٹ" صرف اُس شخص کو ہیومن بینگ قرار دیتا ہے جو اپنی آزادی کا قائل ہو۔ آزادی سے مراد انسان کا اپنے نفس، خواہش اور شہوت کا غلام بن جانا ہے۔ جتنا کوئی شخص اپنے نفس اور خواہش، شہوت کا غلام بنتا چلا جائے گا اتنا ہی وہ آزادی کا حقیقی علمبردار بنتا چلا جائے گا۔ یہی وہ انسان ہے جو خالق کائنات کو رب نہیں مانتا بلکہ اپنے نفس کو ہی اپنا رب بنالیتا ہے لہٰذا اُس کا نفس اُسے جس بات کا حکم دے وہ جائز اور ناجائز، حلال حرام اور صحیح و غلط کی تمیز سے بالاتر ہو کر اُسے بجالانا اپنا فریضہ جانتا ہے کیونکہ ان کے نزدیک خیر و شر وہی ہے جس کا تعین ہیومن بینگ کرے۔ ایسے انسان کی عقل خواہشات کے تابع ہو جاتی ہے اس لیے صحیح اور غلط کا فیصلہ خارج میں موجود کوئی قوت (دین، مذہب، خدا، عقیدہ) نہیں کرتی بلکہ داخلی طور پر عقل خود حرص و ہوس اور شہوات سے مغلوب ہو کر اچھے اور بُرے کا فیصلہ کرتی ہے لہٰذا اگر کسی ہیومن کی خواہش شراب پینے، جوا اور سٹہ کھیلنے، سود کمانے یا بدکاری کرنے کی ہو تو اُسے بلاتردد ان تمام کاموں کو بجالانے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے کیونکہ یہ انسانی نفس کی خواہش اور چاہت ہے البتہ اُسے صرف اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ ان تمام رذائل کو روبہ عمل لانے کے دوران کسی اور ہیومن بینگ کی اسی طرح کی آزادی کی راہ میں اُسے رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔ ایسا انسان ہی حقیقی معنی میں مغرب کی نظر میں اصلی ہیومن بینگ ہے۔ پوری انسانی تاریخ میں پہلی مرتبہ بیسویں صدی عیسویں میں خلق خدا کی بڑی اکثریت ہیومن بن گئی ہے ورنہ سترھویں صدی سے پہلے ہیومن بینگ کا کوئی وجود نہیں تھا۔ لہٰذا مغرب جب حقوق انسانی (Human

---

پروان چڑھایا تاکہ انسان تکبر اور گھمنڈ میں مبتلا ہو کر خالق کائنات کے خلاف سینہ سپر ہو جائے۔ یہ نمرود اور فرعون کی طرح سیاسی، تمدنی اور معاشرتی اُمور میں ایک خدا کی خدائی سلب کرنے کی شیطانی کوشش تھی جو ہیومنزم کی اصطلاح میں لپٹے ہوئے انسان کی خدائی کا جھوٹا دعویٰ تھا۔ اِس نظریے کو مارٹن لُوتھر (۱۵۶۴ء) نے مذہب کی شکل دی جو دنیا پرستی پر مبنی زمینی مذہب قرار پایا۔

Rights) کی بات کرتا ہے تو اس سے مراد وہ مادر پدر آزاد، انسان نما جانور ہیں جو وحی کے مقابلے میں عقل، دین کے مقابلے میں فلسفہ، خدا کے مقابلے میں نفس کی بندگی اور کلام اللہ کے مقابلے میں انسانی فکر و دانش کو ہادی و رہنماء سمجھنے کے قائل ہوں۔ یہ وہ انسان ہیں جو خود کو قائم بالذّات سمجھ کر اس بات کے دعویدار ہیں کہ انہیں خود اس بات کا کلی ادراک ہے کہ ان کے لیے کیا بہتر ہے اور کیا بہتر نہیں ہے۔ اس لیے وہ اپنے درمیان سے اُن انسانوں کو جنہیں وہ دانشور، فلسفی، سائنس دان، اہل فکر و نظر سمجھتے ہیں اور جن کی انفرادی اور اجتماعی آراء، جو تھنک ٹینک (Think tank)، پارلیمنٹ اور عدلیہ کے ذریعہ پیش ہوتی ہیں، کو اس بات کا مکمل استحقاق دیتے ہیں کہ وہ کسی کام یا عمل کے صحیح و غلط، جائز و ناجائز ہونے کا فیصلہ کریں۔ اسی طرح انسانوں کے نظام زندگی، مقصد زندگی اور شاہراہِ زندگی کا تعین بھی یہ افراد اور ادارے کریں۔ جس طرح دنیا کے ہر مذہب کا ایک دیوتا ہوتا ہے اس انسان کا بھی ایک دیوتا ہے اور وہ خود انسان ہے۔

ہیومن رائٹس کی موجودگی میں کروڑوں انسانوں کا قتل؟

ہیومن بینگ کی مذکورہ بالا تعریف پر کوئی مسلمان خواہ کمزور سے کمزور ایمان والا ہی کیوں نہ ہو پورا نہیں اُترتا لہٰذا اُسے (Charter of Human Rights) کے تحت کوئی حق نہیں مل سکتا بلکہ جس طرح جان لاک (John Locke) نے سرخ ہندیوں کو جو ایک روایت کے مطابق حضرت یونس علیہ السلام کے پیروکار تھے، ان کا قتل اور اُن کے املاک کی لوٹ مار کو اس لیے جائز قرار دیا تھا کہ اُس کے بقول سرخ ہندی نہ تو انسان تھے اور نہ ہی انہیں اپنے انسان ہونے کا شعور تھا بلکہ جان لاک ان کے قتل کو اس لیے ضروری سمجھتا تھا کہ اُس کی نظر میں سرخ ہندیوں کی حیثیت آوارہ بھینسوں سے بالکل مختلف نہ تھی جن کو ختم کیے بغیر امریکی دولت میں اضافہ ممکن نہ تھا۔ اسی طرح بیسویں صدی کا بڑا سیاسی مفکر جان رالز لکھتا ہے کہ جو افراد مطلق آزادی کو قدرِ مطلق کے طور پر قبول نہیں کرتے ان کو ختم کرنا اتنا ہی ضروری ہے کہ جتنا ایک متعدی وباء (Pandemic) کا ختم کرنا لہٰذا آزادی کو رد کرنے والوں کو

جواب دلیل سے نہیں گولی سے دیا جانا چاہیے۔ اسی طرح مسلمان، جو ہیومنزم کے اس باطل عقیدہ کے قائل نہیں، ان کا قتل کرنا، ان کی املاک کو لوٹنا نہ صرف جائز ہے، بلکہ ہیومنزم کے فروغ کے لیے ضروری ہے۔ ثانیاً، کیونکہ یہ ہیومن ہیں ہی نہیں، ان کو چارٹر آف ہیومن رائٹس کے تحت کوئی حقوق حاصل نہیں۔ انہی گمراہ کن تعلیمات اور افکار و نظریات کو پیش نظر رکھ کر مغربی ممالک اور امریکہ نے عراق و افغانستان کے مسلمانوں کا بلا تخصیص جنس بڑے پیمانے پر قتل عام کیا اور اپنے اس گھناونے عمل پر کبھی کسی پشیمانی، پچھتاوے کا اظہار نہیں کیا۔ اسی طرح گوانتاناموبے اور ابوغریب میں مسلمان مجاہدین پر ذہنی ،نفسیاتی اور جسمانی روح فرسا تشدد کیا گیا کیونکہ یہ مسلمان آزادی کے قائل نہیں بلکہ رب تعالیٰ کی سچی اور حقیقی بندگی اور رسول کریم ﷺ کی اطاعت و فرماں برداری کی راہ کو حق سمجھتے اور جانتے ہیں۔ لہٰذا ان مجاہدین کو سگریٹ سے داغنا، کرنٹ لگانا، ان کی کھال اُدھیڑنا، ان کو جلانا، اپنا پیشاب پینے پر مجبور کرنا، ان کے ساتھ استہزاء اور ٹھٹا کرنا، اِن کے بچوں کو قتل کرنا، ان کی خواتین کی عصمت دری کرنا، ان کے بزرگوں کی توہین کرنا اس لیے جائز ہو جاتا ہے کہ یہ مغرب کی نظر میں انسان ہی نہیں ہیں۔ لہٰذا ہمارے یہاں وہ تمام ادارے اور تنظیمیں جو حقوق انسانی کی علمبردار بنی ہوئی ہیں اور حقوق انسان اور حقوق العباد کو یکساں سمجھتے ہیں انہیں اس ضمن میں اپنی غلط فہمی جتنی جلدی ممکن ہو دور کر لینی چاہیے ورنہ وہ اپنے آپ کو انسان سمجھتے رہیں گے جبکہ مغرب اُن کو جانور سمجھنے پر بھی راضی نہیں ہو گا کیونکہ مغرب کی نظر میں جانوروں کی بھی اچھے خاصے حقوق ہوا کرتے ہیں جنہیں وہ ادا کرنا ضروری خیال کرتے ہیں اور ان کو قتل کرنا سنگین جرم و ظلم گردانتے ہیں جبکہ مسلمانوں کو اور ہر وہ شخص جو ہیومنزم کے نظریہ کا مخالف ہے اس کے قتل عام کو صحیح بلکہ ضروری سمجھتے ہیں۔

☆☆☆

اقوام متحدہ کے ”ہیومن رائٹس چارٹر“ کا محاکمہ

مولانا ڈاکٹر حبیب الرحمن
مولانا سید شاہ رفیع الدین ہمدانی

ہیومن رائٹس کی تعریف

عام طور پر ”انسانی حقوق“ کی اصطلاح کا ترجمہ ہیومن رائٹس کیا جاتا ہے۔ ”ہیومن“ کی اصطلاح مغربی فلسفہ وفکر میں خاص مقام رکھتی ہے۔ اس اصطلاح ہیومن (human) کا خاص معنی ومطلب ہے۔ لہٰذا ”ہیومن“ کا ترجمہ ”انسان“ کر کے اسے صحیح طور پر سمجھنا ممکن ہی نہیں ہے۔ ”ہیومن“ مغربی فکر میں گاڈ مین (godman) کو کہتے ہیں یعنی ایک ایسا انسان جو آزاد ہو، خود مختار (Autonomous) ہو اور ہر شے و عمل کا میزان ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اللہ کا بندہ ہونے کی بجائے ایک ایسا آزاد فرد ہے جو خیر وشر کے تعیین اور تحدید میں بذات خود ایک پیمانہ ہے۔ مغربی فلسفیوں (ڈیکارٹ، کانٹ، مارکس، نطشے، روسو وغیرہ) کے نزدیک کائنات کو صرف اور صرف ہیومن کے پیمانوں پر پرکھنا ہی مغربی علمیت کی اساس ومیراث ہے۔

مغربی مفکرین کی ان تعریفات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کے ہاں کسی اَن دیکھی ہستی کا وجود خدا کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ ان کے ہاں انسان ہی ان تمام طاقتوں کا مظہر ہے جنہیں کوئی بھی مذہب ان دیکھی ہستی کے ساتھ وابستہ تصور کرتا ہے۔ مغرب کا ”سپرمین“ انہی خدائی طاقتوں کا مظہر ہے۔ مغرب مذہب اور خدا کو کس طرح خیر باد کہہ چکا ہے اس کا اظہار ڈنمارک کے بدبخت شاتم رسول فلیمنگ روز نے ان الفاظ میں کیا تھا:

> ہم میں اور مسلمانوں میں فکری اور ثقافتی یا تہذیبی طور پر فرق یہ ہے کہ ہم نے تو خدا، رسول اور کتاب کا حوالہ اپنے ذہنوں سے اتار دیا ہے، ہم کوئی فیصلہ کرتے وقت یہ نہیں دیکھتے کہ بائبل میں کیا لکھا ہے۔ کوئی قانون طے

کرتے وقت یہ نہیں دیکھتے کہ خدا کیا کہتا ہے، کوئی بات کہتے وقت عیسیٰ کا حوالہ نہیں دیتے کہ اس بارے میں انہوں نے کیا کہا تھا، ہم آزاد (شیطانی) ذہن سے فیصلہ کرتے ہیں۔

اس مخصوص تصورِ علم اور تصورِ انسان کو ہیومن بینگ (Human Being) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مغربی مفکرین کے مطابق جب انسان ہی کائنات کا محور و مرکز ہے اور وہ اشیا کی حقیقتوں کو بغیر کسی خارجی علم کی مدد کے خود پہچان سکتا ہے اور اپنی مرضی کے مطابق اپنی زندگی استوار کر سکتا ہے تو اس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ وہ اپنی چاہت و خواہشِ نفس کا مطیع ہے۔ انسانی خواہشات کا بنیادی عنصر لذات سے زیادہ سے زیادہ متمتع ہونا ہے۔ یہ بات اس وقت تک ممکن نہیں جب تک انسان اول درجے کا حریص اور حاسد نہ ہو۔ حرص اور حسد دیگر کئی اخلاقی بیماریوں اور کمزوریوں کا مجموعہ ہیں۔ حریص اور حاسد انسان خود غرض، سفاک، قاتل، انتہائی درجے کا فریبی اور مکار اور نہ جانے کیا کچھ ہو سکتا ہے۔ جو شخص خود کو "فری" (Free) بمعنی آزاد خیال کرتا ہو اور اللہ تعالیٰ کی نگہبانی میں اور عبدیت میں رہنے کے لیے تیار نہ ہو، وہ دراصل نفس و شیطان کا بندہ ہوتا ہے ان معنوں میں ہیومن بیئنگ شیطنت (طاغوت) کے مساوی ہے۔ یہی ہیومن رائٹس کا علمیاتی پس منظر ہے۔

ہیومن رائٹس کا تاریخی پس منظر

سترھویں صدی عیسوی میں جب جدید یورپ کی ابتدا ہوئی تو اس دور میں جو فکر ابھر کر سامنے آئی اس کے مطابق انسان کسی کا عبد نہیں بلکہ وہ آزاد (Free) ٹھہرایا گیا۔ آزاد ان معنوں میں کہ وہ جو چاہنا چاہے چاہ سکے اور جس چیز کی خواہش اس کا نفس کرے اسے حاصل کر سکے۔ یہ ایک مغربی فکر ہے جس کے مطابق انسان قائم بالذّات اور اپنا خالق خود (Existent by itself) ہے۔ اس فکر کی اساس پانچ صدی قبل مسیح کی یونانی فکر میں بھی ملتی ہے جس میں یونانی مفکر پروتاگورس کہتا ہے:

"انسان کائنات کی تمام اشیا کا پیمانہ ہے۔"

یعنی وہ اس کائنات میں مقصود بالذات ہستی ہے اور وہ کائنات کی ہر شے کو اپنی مرضی (decision) اور منشاء (will) کے تابع کرنے کا حق رکھتا ہے۔ یہ نظریہ عبدیت انسانی کے بجائے "الوہیت انسانی" کا مظہر ہے، اور اسی تناظر میں تہذیب مغرب کا کلمہ لا الہ الا اللہ کے بجائے "لا الٰہ الا انسان" ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کا مرکز ذاتِ باری تعالیٰ نہیں ہے بلکہ انسان ہے۔ اس تصور کو ہیومنزم بھی کہتے ہیں۔ ہیومن ازم ہر اس فلسفہ کو کہتے ہیں جو تمام دوسری اشیا بلکہ خود خالقِ کائنات کی عظمت کے مقابلے میں انسانی قدر یا عزت کو برتر تسلیم کرے اور اسے "تمام چیزوں کا میزان" قرار دے یعنی میزانِ حق و باطل کا تعین خود انسان کرے گا اس کے لیے کوئی بھی خارجی قوت بشمول ذاتِ خداوندی، وحیٔ الٰہی، انبیاء و رسل یا صالحین اور علمائے کرام کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

ہیومن ازم کی تحریک اپنی اصل کے اعتبار سے وحیٔ الٰہی اور ہدایت ربّانی کی ضد تھی۔ اس تحریک کا مقصد مذہبی معاشرے میں تصورِ الٰہ، تصورِ رسول اور تصورِ آخرت کو ختم کر دینا تھا۔ چنانچہ اس تحریک نے اہل مذہب کو ہر اس ہدایت کے انکار کی طرف ابھارا جو ربانی یا آسمانی ہو اور ہر اس ضابطے سے بغاوت پر آمادہ کیا جس کی بنیاد ہدایت الٰہی تھی۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انسائیکلوپیڈیا آف ریلجن اینڈ ایتھکس میں بیان کیا گیا ہے:

> فلسفہ میں ہیومن ازم ہر طرح کی فطریت (ربانیت) اور کلیت کی ضد ہے۔ یہ ایک ایسا فلسفیانہ رجحان دیتا ہے جو انسانی تجربوں کی تشریحات کو ہر طرح کے فلسفہ کا اولین مرکز توجہ قرار دیتا ہے اور اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ اس کام کے لیے انسانی علم کافی ہے۔

یونیورسل ڈکلیئریشن آف ہیومن رائٹس

تاریخی طور پر دیکھا جائے تو ۱۷۷۶ء میں امریکا کا اعلانِ آزادی سامنے آیا۔ ۱۷۸۸ء میں امریکی دستور مرتب ہوا۔ امریکی دستور کا ماخذ فیڈرلسٹ پیپرز ہیں۔ فیڈرلسٹ پیپرز وہ مضامین تھے جو دستور کی حمایت میں امریکا کے پہلے وزیر خزانہ الیگزینڈر ہملٹن، امریکا کے

پہلے چیف جسٹس جان جے اور امریکی صدر جیمس میڈیسن نے امریکی اخباروں میں لکھے تھے۔ ہیومن بینگز کے حقوق سے متعلق یہ تمام مضامین مغرب کے ملحد مفکرین کے تصوراتِ انسان ہی کی روشنی میں لکھے گئے تھے۔ اقوام متحدہ کا منظور کردہ انسانی حقوق کا منشور اسی امریکی دستور کا چربہ ہے۔ اس منشور کی مصنفہ سابق امریکی صدر کی بیوی ایلینا روزویلٹ تھی۔ اقوام متحدہ کے ذریعہ تمام ممبر ممالک کو اس بات کا پابند کیا گیا کہ وہ انسانی حقوق کے اس منشور کو عالمی اور ناقابل چیلنج قانون تسلیم کرتے ہوئے اس پر دستخط کریں۔ چنانچہ مسلم ممالک بھی یو این او کے رکن ہونے کی حیثیت سے اس کفر مطلق اور اللہ تعالیٰ سے بغاوت پر مبنی منشور پر دستخط کرتے ہیں۔ وہ پابند ہوتے ہیں کہ اپنے ممالک کے دستور و قانون کو انسانی حقوق کے چارٹر سے ہٹ کر عمل میں نہ لائیں۔

یونیورسل ڈکلیئریشن آف ہیومن رائٹز کی پہلی شق

All human beings are born **free** and **equal** in dignity and **rights**. They are endowed with **reason** and conscience and should act towards one another in a spirit of **brotherhood**.

ترجمہ: تمام ہیومن بینگز آزاد پیدا ہوئے ہیں اور عزت اور حقوق میں مساوی ہیں۔ وہ عقل اور شعور (خیر اور شر میں فرق کرنے کی صلاحیت) کے حامل ہیں اور انہیں ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارے کے جذبے سے کام لینا چاہیے۔

یونائٹڈ نیشنز کے چارٹر آف ہیومن رائٹس کی شقیں ایسی اصطلاحات پر مشتمل ہیں جس کو سمجھے بغیر ایک عام انسان اور خاص طور ہر مسلمان دھوکے کا شکار ہو جاتا ہے اور اس چارٹر کو عین اسلامی اور انسانیت کی بھلائی پر مبنی سمجھ کر کے نہ صرف اس کو قبول کرتا ہے بلکہ اس کو عام کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ درج ذیل سطور میں ان اصطلاحات کی اصل تعریف اور ان کے حوالہ سے قرآن و سنت کی روشنی میں اسلام کے مؤقف کو پیش کیا جائے گا۔

ہیومن بینگ اور انسان

اسلام میں نہ ہیومن بینگ ہیں اور نہ ہی ان کے حقوق کا کوئی تصور موجود ہے۔ اسلام حقوق العباد کو تسلیم کرتا ہے جس کا تعلق فرائض و حقوق اللہ سے ہے۔ فرائض / حقوق اللہ کی ادائیگی مقدم اور حقوق العباد کی ادائیگی مؤخر ہے یعنی حقوق العباد کا شعور فرائض / حقوق اللہ کی ادائیگی کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالی نے انسان کی حیثیت اپنے عبد کی رکھی ہے اور اسی لیے اس سے ہر لحظہ و لمحہ عبدیت مطلوب ہے، کیونکہ انسان کا مقصدِ تخلیق ہی عبودیت قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ (الذاریات، ۵۶)

اور میں نے جنّات اور انسانوں کو صرف اسی لیے پیدا کیا کہ وہ میری بندگی اختیار کریں۔

قرآن کریم میں اس آیت مبارکہ میں مذکور "انسان" سے مراد ہیومن (Human) ہرگز نہیں ہے، کیونکہ وہ اپنی اصل اور حقیقت کے اعتبار سے سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن اللہ کا بندہ اور خدا کے کسی بھی پیغمبر کا پیروکار نہیں ہو سکتا۔ ہیومن Human جس مذہب کا پیروکار ہوتا ہے وہ Humanism کہلاتا ہے۔ یہ ہیومن (Human) کسی بھی الہامی مذہب، الہامی عقائد و تصورات اور نظریات کے برعکس انسانی پیش کردہ فکر و فلسفہ اور قوانین و نظریات کا پیروکار ہوتا ہے۔ یہی وہ انسان ہے جو خالق کائنات کو رب نہیں مانتا بلکہ اپنے نفس کو ہی اپنا رب بنالیتا ہے۔ لہٰذا اس کا نفس اُسے جس بات کا حکم دے وہ جائز اور ناجائز، حلال حرام اور صحیح و غلط کی تمیز سے بالاتر ہو کر اُسے بجالانا اپنا فریضہ جانتا ہے۔ اس کے نزدیک خیر و شر وہی ہے جس کا تعین ہیومن بینگ کرے۔ لہٰذا اگر کسی ہیومن کی خواہش شراب پینے، جوا اور سٹہ کھیلنے، سود کمانے یا بدکاری کرنے کی ہو تو اُسے بلاتردد ان تمام کاموں کو بجالانے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے کیونکہ یہ نفس کی خواہش اور چاہت ہے البتہ اُسے صرف اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ ان تمام رذائل کو روبہ عمل لانے کے دوران کسی اور ہیومن بینگ کی اسی طرح کی آزادی کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ بنے۔ ایسا انسان ہی حقیقی معنی میں

مغرب کی نظر میں اصلی ہیومن بیئنگ ہے۔ پوری انسانی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ بیسویں صدی عیسویں میں خلق خدا کی بڑی اکثریت (Human being) بن گئی ہے ورنہ سترویں صدی سے پہلے (Human being) کا کوئی وجود نہیں تھا۔ لہٰذا مغرب جب حقوق انسانی کی بات کرتا ہے تو اس سے مراد ہر ابن آدم ہر گز نہیں ہے بلکہ صرف وہ مادر پدر آزاد، انسان نما جانور یعنی ہیومن بیئنگ ہیں جو وحی کے مقابلے میں عقل، دین کے مقابلے میں فلسفہ، خدا کے مقابلے میں نفس کی بندگی اور کلام اللہ کے مقابلے میں انسانی فکر و دانش کو ہادی ورہنما سمجھنے کے قائل ہوں۔

مذکورہ بالا آیت کی تعلیم کے مطابق انسان یعنی کہ عبد اپنے شب وروز اللہ کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق بسر کرے۔ ہر اس کام کو کرنا اس کے لیے جائز ہو گا جس کی اجازت رب نے اسے عطا کی ہے اور ہر اس کام سے بچنا واجب ہو گا جس سے رکنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس طور پر انسان کو حلال رزق کا حصول، حلال کھانے پینے کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے، ضروریات زندگی کی تکمیل کرنے، اپنی جائز خواہشات کو پورا کرنے کی اجازت ہے، لیکن یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ یہ سارے امور دین (وحی الٰہی) کے اصولوں اور طریقوں کے مطابق ہی سرانجام دیے جائیں گے۔

آزادی

آزادی کے لغوی معنی یہ ہیں کہ آپ کچھ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور اس معاملہ میں مجبور نہیں ہیں مثلاً جانور حرکت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ اس معنی میں آزاد ہیں لیکن وہ کلام (بمعنی گفتگو نہیں کرسکتے ان معنوں میں وہ مجبور ہیں)۔ لغوی اعتبار سے آزادی ایک صفت اور صلاحیت ہے جیسے سانس لینے کی صلاحیت ہے، کھانا کھانے کی صلاحیت ہے۔ اصطلاحی طور پر آزادی سے مراد یہ ہے کہ ہر انسان ہر معاملہ میں آزاد وخود مختار ہے یعنی وہ کسی ان دیکھی ہستی کا عبد نہیں ہے۔ اس کی عقل جو کہ نفس امارہ کے تابع ہے اس کے لیے واحد اتھارٹی (authority) ہے جو اس بات کا فیصلہ کرے گی کہ شر کیا ہے اور خیر کیا ہے۔

کسی خارجی ذریعے یا خارج از عقل ہستی کو خیر اور شر کے تعین کا حق حاصل نہیں ہے۔ آزادی خیرِ مطلق ہے اور آزادی سے مراد یہ ہے کہ انسان کا اختیار کائنات پر لامحدود ہوتا چلا جائے، اصولاً انسان آزاد ہے وہ اپنے اندر یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ قائم بالذات اور خالقِ کائنات بن جائے لیکن عملاً وہ آزاد نہیں، اس کی آزادی کو مادی (Material) قوتیں بھی محدود کرتی ہیں اور معاشرتی (Social) قوتیں بھی۔ عملاً انسان آزاد ان معنوں میں ہے کہ وہ اپنی تصور کردہ مطلق العنان ربوبیت کے قیام کی مستقل جدوجہد کرنے پر مجبور ہے۔ اسی عملی مجبوری کو اصولی آزادی کہتے ہیں۔ اس قاعدہ کے مطابق اگر کوئی شخص بذات خود کسی بھی وجہ سے زنا کا مرتکب نہیں ہوتا تو اس معاملہ میں وہ آزاد ہے لیکن اگر کوئی اور کسی کے ساتھ زنا بالرّضا کا ارتکاب کرتا ہے تو یہ عمل بد نہیں ہے بلکہ زانی، زنا کے ذریعے اپنی آزادی کا اظہار کرتا ہے۔ اسی لئے کسی ریاست یا قانون کو اسے اس عمل پر سزا دینے کا کوئی حق حاصل نہیں ہوتا۔

اسلام آزادی کو بحیثیت ایک قدر (Value) کے کلیتاً اور صریحاً رد کرتا ہے کیونکہ آزادی اللہ سے بغاوت کی جدید شکل اور جدید نعرہ ہے۔ مسلمان کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ اپنی پیدائش کے وقت سے لے کر تادمِ واپسیں آزادی کو بطور قدر کے رد کرتا ہے۔ آج آزادی غلامی کی ضد کے طور پر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ، وحیِ الٰہی اور بندگی کے انکار کے طور پر تسلیم کی جاتی ہے۔ اس آزادی کا مطلب یہ ہے کہ انسان اگرچہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو اگر کفر کو اختیار کرنا چاہے تو وہ کفر کو اپنے آزاد ہونے کی وجہ سے اختیار کرنے کا حق رکھتا ہے اور اس کا یہ حق ہے کہ وہ جب چاہے ملحد و منکر خدا و دین بن جائے۔ اسی طرح اسلام میں آزادی کا یہ تصور کسی بھی صورت میں ممکن نہیں ہو سکتا کہ کسی مسلمان کے سامنے کسی بھی قسم کے گناہ کا ارتکاب کیا جائے اور وہ یہ سمجھے کہ گناہ کے اس ارتکاب کے لیے گناہ گار کے پاس حق آزادی کی وجہ سے اس کو روکنا، منع کرنا یا برا سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان کے ایمان کی تعریف حضور ﷺ نے ان الفاظ میں فرمائی ہے:

عن أبي سعيد الخدري رضي الله عنه قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: من رأى منكم منكرا فليغيره بيده ، فإن لم

يستطع فبلسانه، فإن لم يستطع فبقلبه، وذلك أضعف الإيمان۔
(رواه مسلم)

حضرت ابو سعید خضری سے روایت ہے کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: تم میں سے جو کوئی کسی منکر (برائی) کو ہوتا ہوا دیکھے تو اسے چاہیے کہ اسے اپنے ہاتھ (بزور قوت) سے روکے اور اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو اسے اس منکر کو زبان سے روکنا چاہیے اور اگر اس کے لیے یہ بھی ممکن نہ ہو تو اسے چاہیے کہ اسے دل میں برا جانے حالانکہ یہ ایمان کا سب سے کم تر درجہ ہے۔

مذکورہ بالا حدیث میں کسی بھی انسان کو آزادی کے نام پر یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ وحی الٰہی کے مقرر کردہ خیر کو شر اور شر کو خیر سمجھے۔ اسی طرح وحیٔ الٰہی نے نیکی اور گناہ کا واضح تصور دیا ہے جس پر انسان کی اخروی کامیابی یا ناکامی کا دارومدار ہے۔ لہٰذا انسانی معاشروں میں انسان اور بالخصوص مسلمان کسی بھی انفرادی یا اجتماعی گناہ سے اس لیے لاتعلق نہیں رہ سکتا کہ اسے انسانوں نے نام نہاد "آزادی" کی آڑ میں جائز قرار دے رکھا ہے۔ مسلمان اپنی حیثیت اور قوت کے لحاظ سے ہر قسم کی برائی کی راہ میں رکاوٹ بنے گا کیونکہ یہی اس کا حق و فرضِ بندگی ہے جسے ادا کرنے کے لیے اسے ہمیشہ تیار رہنا چاہیے۔ اسی بات کو درج ذیل آیات بینات میں بیان کیا گیا ہے:

﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ۗ وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُم ۚ مِّنْهُمُ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُونَ﴾[آل عمران:۱۱۰]

ترجمہ: تم بہترین اُمّت ہو جو سب لوگوں (کی رہنمائی) کے لیے ظاہر کی گئی ہے، تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ﴾ [النحل:۹۰]

ترجمہ: بے شک اللہ (ہر ایک کے ساتھ) عدل اور احسان کا حکم فرماتا ہے اور قرابت داروں کو دیتے رہنے کا اور بے حیائی اور برے کاموں اور سرکشی و نافرمانی سے منع فرماتا ہے، وہ تمہیں نصیحت فرماتا ہے تاکہ تم خوب یاد رکھو۔

مذکورہ بالا آیات میں واضح طور پر اہل ایمان کو خیر امت قرار دینے کے بعد ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ ذمہ داریوں کو بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ ہیں کہ وہ مسلسل اسلام کی دعوت دیتے رہیں اور وہ ان تمام اعمال کی، جو اسلامی تعلیمات کی ضد اور ممنوعات ہیں، سرکوبی کے لیے جہاد کرتے رہیں گے۔ اسی کے ساتھ ساتھ خیر امت کا فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ آزادی کے نام نہاد تصور کو رد کر کے اپنی بندگی کے اقرار کے ساتھ عدل و احسان، حقوق العباد کی ادائیگی کریں گے اور فحاشی، برائی اور اللہ سے بغاوت کی ہر صورت کو رد کر دیں گے۔

مساوات

مغرب کے نظریہ مساوات سے مراد یہ ہے کہ تمام انسان پیدائشی اعتبار سے برابر ہونے کی وجہ سے یکساں ہیں لہٰذا تمام انسان اپنی عقل کے اعتبار سے بھی برابر ہیں جس کے نتیجے میں ہر شخص کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ کسی خارجی ذریعہ کے بغیر خود اپنی عقل کی بنیاد پر اپنے لیے جس طرح کی زندگی کو تعمیر کرنا چاہے وہ کر سکتا ہے اور جس طرح ایک انسان اپنی زندگی عقل کی بنیاد پر تعمیر کرنے کا حق رکھتا ہے اسی طرح دوسرے تمام افراد بھی اس حق میں مساوی ہیں کہ وہ جس طرح کی زندگی کو چاہیں اختیار کریں۔ یعنی کوئی شخص یہودیت کو اختیار کرے یا عیسائیت کو اپنائے، ہندومت سے وابستہ ہو یا الحاد کو اپنے لئے پسند کرے تو کسی دوسرے شخص کو اس بات کا حق نہیں کہ وہ اس کے اس اختیار پر پابندی عائد کرے کیونکہ

جس طرح کسی نے اپنے لئے ایمان و اسلام کو پسند کیا تھا اسی طرح دوسرے افراد کو یہ اختیار ہے کہ وہ جو مذہب وعقیدہ چاہے اسکا انتخاب کرے۔ اس انتخابِ اخلاق و عمل میں تمام انسان بالکل برابر ہیں۔ لہذا خیر و شر یا حق و باطل اضافی بات ہے جس کے اختیار یا رد کرنے پر اصرار کسی دوسرے انسان کی مساوات کے حق سے انکار کے مترادف ہے۔ لہٰذا کسی متقی کو کسی فاجر و فاسق پر کوئی برتری حاصل نہیں اور نہ ہی کسی صاحبِ کردار کو کسی بد کردار کے مقابلہ میں اہمیت حاصل ہے کیونکہ یہ ذاتی اختیار کا معاملہ ہے جس کے تحت کوئی شخص انفرادی طور پر مسجد میں جاکر کے عبادت کرنا پسند کرے یا کسی بدکاری کے اڈے پر جاکر حظِ نفس حاصل کرے یا کوئی شخص قرآن کریم کی تلاوت کرے یا کہیں بیٹھ کر کے گانا گائے (نعوذ باللہ) سب دنیاوی قدر و اہمیت کے لحاظ سے برابر (مساوی) ہیں۔

اس کے برعکس اسلام میں اس طرح کی مساوات کا کوئی تصور موجود نہیں بلکہ معاشرے میں موجود انسانوں کے مختلف درجات اور فضیلت کے معیارات ایمان اور تقویٰ کی بنیاد پر جدا جدا ہیں۔ اسلام میں ایمان اور کفر برابر نہیں کیونکہ ایمان کو نور اور کفر کو ظلمت سے تعبیر کیا گیا ہے اور مومن کو بینا جبکہ کافر کو اندھا کہا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ﴾ [فاطر:۱۹]

ترجمہ: اور اندھا اور بینا برابر نہیں ہوسکتے۔

اسی طرح نیکی اور بدی برابر نہیں اور نہ ہی نیک اور بد برابر ہیں کیونکہ نیکی انسان کو جنت میں لے جانے والا عمل ہے جبکہ بدی انسان کو دوزخ میں پہنچا دیتی ہے۔ انسان کی کامیابی یہ ہے کہ وہ اصحاب جنت میں سے ہو جائے اور اپنی ہر ممکن کوشش کرے کہ اس کا شمار اصحاب النار میں نہ ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَا يَسْتَوِي أَصْحَابُ النَّارِ وَأَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۚ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَائِزُونَ﴾ [الحشر:۲۰]

ترجمہ: اہلِ دوزخ اور اہلِ جنت برابر نہیں ہوسکتے، اہلِ جنت ہی کامیاب و کامران ہیں۔

جس طرح اسلام کی رو سے تمام انسان برابر نہیں ہیں اسی طرح تمام اشیا بھی اپنی تخلیق، اثرات، احکامات اور نتائج کے اعتبار سے برابر نہیں ہیں۔ ان کے اندر غیر مساویت کو خود اللہ تعالیٰ نے ودیعت کر کے اس کو جائز و ناجائز، حلال و حرام اور طیب و خبیث میں تقسیم کر دیا ہے۔ بالفاظ دیگر خیر یا پاک شے وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ خود خیر اور پاک قرار دے جبکہ ناپاک اور شر وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنی وحی کے ذریعے ناپاک اور شر قرار دے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ قُل لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ أَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيثِ ۚ فَاتَّقُوا اللَّهَ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾ [المائدۃ:۱۰۰]

ترجمہ: فرما دیجئے: پاک اور ناپاک (دونوں) برابر نہیں ہو سکتے (اے مخاطب!) اگرچہ تمہیں ناپاک (چیزوں) کی کثرت بھلی لگے۔ پس اے عقلمند لوگو! تم (کثرت و قلت کا فرق دیکھنے کے بجائے) اللہ سے ڈرا کرو تاکہ تم فلاح پا جاؤ۔

اسی طرح عالم و جاہل بھی مساوی نہیں کیونکہ وہ علم جو اللہ کی معرفت و خشیت عطا کر دے (علم دین) وہ اس علم یا معلومات کے مقابلہ میں ہزار درجہ بہتر و مفید ہے جس سے انسان اللہ تعالیٰ کی اطاعت و بندگی سے غافل ہو جائے اگرچہ کہ وہ علم دنیاوی اعتبار سے اس معنی میں مفید ہو کہ اس کے ذریعے جاہ و منصب اور عہدہ و مال حاصل کیا جا سکے۔ قرآن کی رو سے ہر وہ علم یا معلومات جو انسان کو مقصدِ زندگی سے غافل کر دے جہالت ہے۔ اسی لیے ایسے علم کی اللہ تعالیٰ نے تحسین فرمائی ہے جو بندے کو حقیقت شناس بنا دے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿۔۔۔ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۗ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ﴾ [الزمر: ۹]

ترجمہ:۔۔ فرما دیجئے کیا جو لوگ علم رکھتے ہیں اور جو لوگ علم نہیں رکھتے (سب) برابر ہو سکتے ہیں؟ بس نصیحت تو عقل مند لوگ ہی قبول کرتے

ہیں۔

مذکورہ بالا نصوص کی روشنی میں مساوات کے حوالہ سے اسلامی تعلیمات بالکل واضح اس طور پر ہیں کہ اسلام تمام انسانوں کے یکساں حقوق کا بالکل بھی قائل نہیں کیونکہ تمام انسان علم، اخلاق، کردار، سیرت، عمل، محنت، عبادت، تقویٰ اور رویوں میں برابر نہیں ہیں اسی لیے اسلام میں حقوق کی ادائیگی کو فرائض کی ادائیگی کے ساتھ مشروط کر دیا گیا ہے۔ مطلق حقوق کا تصور خود انسانی معاشروں میں بھی عملی طور پر ناممکن ہے کیوں کہ اپنے ذمہ کے فرائض ادا کیے بغیر باپ اپنے بیٹے کو، ماں اپنی بیٹی کو، استاد اپنے شاگرد کو اور کارخانہ دار اپنے ملازم کو کسی قسم کا حق یا حقوق دینے کا پابند نہیں کر سکتا۔ اسی طرح ہر وہ شخص جو اپنا فریضہ تخلیق یعنی عبدیت و بندگی بجالانے سے انکاری ہو وہ اُن تمام حقوق سے یکسر محروم ہو جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے اُن کی بندگی و اطاعت پر رضامندی کی وجہ سے مختص فرمائے ہیں۔ بر سبیل تنزل اس معاملہ کو کسی ملک کے عام شہری اور مجرم شہری کے تناظر میں دیکھا اور سمجھا جاسکتا ہے یعنی عام شہری جو ملک کے قوانین کا پاسدار اور ریاست کا وفادار ہو اور وہ شخص جو ملکی قوانین کو رد کرنے والا اور ریاست کا غدار ہو شہری ہونے کے اعتبار سے یکساں ہونے کے باوجود حقوق کے لحاظ سے یکساں نہیں ہوتے کیونکہ ایک شہری کے حقوق فرمانبردار اور ذمہ دار شہری کی حیثیت سے اور دوسرے کے باغی اور مجرم شہری کی حیثیت سے برابر نہیں ہوتے ہیں۔

عقل و شعور (Reason and Consciousness)

عقل سے عمومی مراد صحیح و غلط اور خیر و شر کا وہ پیمانہ ہے جسے اگر الہامی تعلیمات کی روشنی میں استعمال کیا جائے تو انسان اس عقل کی مدد سے حق و باطل کے درمیان امتیاز کرنے کی صلاحیت کو پالیتا ہے۔ اس کے برعکس مغربی تہذیب کا نظریۂ عقل (reason) جو کہ تحریک تنویر کے مفکرین نے پیش کیا اس کے مطابق عقل (reason) وہ صلاحیت ہے جس کے ذریعے زندگی کا حتمی مقصد لذت کی تلاش ہے اور چونکہ تمام انسان یکساں عقل

(reason) رکھتے ہیں اسی لئے تمام لوگوں کی عقل (reason) کا یہ تقاضا ہے کہ وہ لذت کی تلاش میں اپنی زندگی کھپا دیں اور اس کے لیے جو اعمال بروئے کار لانے ہوں لے آئیں۔ عقل (reason) کی مزید وضاحت کرتے ہوئے ڈیوڈ ہیوم کہتا ہے کہ چونکہ انسان کا مقصد لذت کی تلاش ہے لہٰذا عقل (reason) نفس امارہ یا خواہشات نفسانی یا انسانی جذبات کی غلام ہے۔ تنویری مفکرین کے مطابق ہیومن کی عقل (reason) ہمیشہ خیر ہی ہوا کرتی ہے کیونکہ ہیومن خود سراپا خیر ہے۔ اس لیے اگر ہیومن کسی برائی یا شیطانی عمل کی چاہت کے لیے تگ و دو کرے تب بھی اس کی یہ چاہت برائی نہیں خیر ہی ہے کیونکہ ہیومن کی عقل (reason) کبھی کچھ غلط نہیں چاہ سکتی۔ اس ہیومن کی عقل افغانستان میں لاکھوں مسلمانوں کو اپنی چاہت کے تحت قتل کر دے، بوسنیا میں لاکھوں مسلمانوں کو ہیومنزم قبول نہ کرنے کی وجہ سے جان سے مار دے یا پھر فلسطین میں یہ ہیومن صیہونیوں کے ہاتھوں سے مسلمانوں کی نسل کشی کو اس لیے جائز قرار دے کہ وہ ان کی طرح کے ہیومنز نہیں ہیں، یہ سب ان ہیومنز کی نگاہ میں خیر بھی ہے اور ضروری بھی۔ یہی عقل (reason) ہیومن کو بتاتی ہے کہ اس کے حقوق اور ذمہ داریاں کیا ہیں یعنی اللہ تعالیٰ، اس کا رسول ﷺ اور آسمانی وحی کو اس بات کا کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ انسانوں کے لیے حقوق اور ذمہ داریوں یا فرائض و احکامات کا مجموعہ احکام الٰہی کے عنوان کے تحت عطا کریں کیونکہ انسانی عقل خود صحیح اور غلط یا حق و باطل کے درمیان فرق کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم رکھتی ہے۔

اسی لیے آسمانی عقائد پر ایمان سے گلو خلاصی کرنے کے بعد مغرب نے ہیومن اخلاقیات (morality) کو بھی ایمانیات سے جدا کر کے اس کی اساس و بنیاد ہیومن کی عقل (reason) پر رکھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے نزدیک کسی بھی مقدس صحیفے یا کتاب سماوی کی دی ہوئی ہدایات و احکامات کے مطابق اپنے انفرادی و اجتماعی اخلاقیات کو مرتب و منظم کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ وہ ہیومن عقل (reason) ہے جو انسان کے لئے زندگی گذارنے کے عقائد اور اخلاقی اصول کو مرتب و منظم کرتی ہے۔ ہیومنز کے وضع کردہ ان عقائد و اخلاقیات کو مغرب نے آفاقیت کا درجہ دے کر روئے زمین کے تمام انسانوں پر ابدی و حتمی نظامِ زندگی کے طور پر نافذ کرنے کی کوشش اس طور پر کی ہے کہ

اگر ان کی اس جدوجہد کی راہ میں کسی گروہ، ملک یا تہذیب نے رکاوٹ کھڑی کرنے کی اعلانیہ یا غیر اعلانیہ کوشش کی تو اسے ملیامیٹ کرنا بھی ہیومن اخلاقیات کا بنیادی اصول ہے۔ اسی اصول کے تحت مغرب یا مغرب کے پروردہ ممالک پوری دنیا میں مسلمانوں کا خون بہانا نہ صرف اپنا حق سمجھتے ہیں بلکہ اسے اپنے مزعومہ ایمان واعتقاد اور اخلاقیات کا اولین اصول بھی سمجھتے ہیں کیونکہ یہ مسلمان ہی ہیں جو کسی بھی طور پر بھی ہیومن بمعنی خدا سے باغی بننے پر بالکل تیار نہیں ہیں۔

مغرب میں تنویری عقل (reason) کو غیر معمولی اہمیت دی جاتی ہے اور یونانی و مغربی فلاسفہ کے مقلدین مبالغہ کی حد تک اس کو وحی کے متبادل کے طور پر پیش کرتے ہیں حالانکہ انسان کو یہ عقل اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے دوسری تمام مخلوقات کے مقابلہ میں فضیلت کی وجہ سے اور حق و باطل میں فرق کرنے کے لیے بطور صلاحیت یا آلہ کے عطا کی گئی ہے۔ ان عقلی صلاحیتوں کے بل پر جو اصول دریافت کیے گئے ہیں ہیومنزم کے ماننے والے انہیں کسی بھی قسم کی غلطی سے پاک اور ناقابل تغیر تصور کرتے ہیں۔ اس تدبر و تعقل کی غیر معمولی صلاحیتوں کی بنا پر انہوں نے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا کہ مذہبی احکام محض بے بنیاد مفروضوں اور غیر اہم حقائق سے متعلق بیانات کا مجموعہ ہیں اور انہیں کسی بھی قسم کی برتری کا حامل قرار نہیں دیا جاسکتا۔

اسلامی تعلیمات کے مطابق عقل (reason) محض اپنے بل بوتے پر اس قابل نہیں کہ وہ کسی انسان کی اس کے اصلی مقصد کی طرف رہنمائی کر سکے اور نہ ہی وہ سراپا خیر ہے۔ انسانی عقل (reason) میں خیر بھی موجود ہے اور شر بھی کیونکہ یہ دونوں صلاحیتیں اللہ تعالیٰ نے اس کو ودیعت کی ہیں۔ یہ سراپا خیر اس وقت بنتی ہے جب کلیۃ الہامی ہدایت کی روشنی میں حق اور باطل کے درمیان فرق سمجھ کر امتیاز کرے جبکہ اگر یہ عقل (reason) خود مختار (autonomous) اور وحیٔ الٰہی سے آزاد ہو کر کچھ کرنے کی کوشش کرے گی تو لازماً اس میں شر کا عنصر پایا جائے گا کیونکہ رحمانی ہدایت کے مقابلہ میں شیطانیت ہی آتی ہے اور اگر رحمانی ہدایت سے استفادہ نہ کیا جائے تو شیطان اپنے علم اور روحانیت سے انسان کو دھوکہ دے کر اپنی اتباع کرواتا ہے۔ لہٰذا عقل یا تو صالح ہوتی ہے یا طالح۔ عقلِ صالح کا وجود ایمان و

ہدایت الٰہی کا مرہون منت ہوتا ہے جبکہ عقل طالح نفس و شہوات سے مغلوب ہوتی ہے۔
امام غزالی کے نزدیک عقل صالح وہ ہے جو انسان کو رب کے پاس بزرگی دے اور اصل معنوں میں عاقل وہ ہے جو اللہ کی اطاعت کرے چاہے (بظاہر وہ) صورت میں برا، قد میں چھوٹا اور مرتبہ میں شکستہ حال ہو جبکہ عقل فاسد وہ ہے جو انسان کو رب سے دور کرے اور اس کے متبعین جاہل ہیں کیونکہ وہ خدا کی نافرمانی اور وحیٔ الٰہی کا انکار کرتے ہیں۔ کچھ اکابرین کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے عقل کو پیدا کیا اور فرمایا کہ تیری ہی وجہ سے ثواب دوں گا اور تیری ہی وجہ سے عذاب دوں گا۔ اسی طرح عقل صالح کے حامل شخص کو بصیر (دیکھنے والا) اور اس سے عاری شخص کو اعمیٰ (اندھا کہا گیا ہے)۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ﴾ [فاطر:۱۹]

ترجمہ: اور اندھا اور بینا برابر نہیں ہو سکتے۔

امین احسن اصلاحی صاحب فرماتے ہیں کہ یہاں اعمیٰ سے مراد عقل و دل کا اندھا ہونا (عقل فاسد) مراد ہے۔ بصیر سے وہ لوگ مراد ہیں جن کی عقل صالح اور دل کی صلاحیتیں زندہ ہیں اور وہ ان سے کام لیتے ہیں۔ اسی لئے قرآن کریم ان لوگوں کو جو وحیٔ الٰہی سے استفادہ کرنے کے بجائے اپنی عقل فاسد پر بھروسا کرتے ہیں سخت تنبیہ کرتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَقَدْ أَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ كِتَابًا فِيهِ ذِكْرُكُمْ ۖ أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾
[الأنبياء: ۱۰]

ترجمہ: بیشک ہم نے تمہاری طرف ایسی کتاب نازل فرمائی ہے جس میں تمہاری نصیحت (کا سامان) ہے، کیا تم عقل نہیں رکھتے۔

یعنی یہ کتاب ہے جس میں انسان کی زندگی کا مقصد، اس مقصد تک پہنچنے کا طریقہ، زندگی گذارنے کا ڈھنگ پیش کیا گیا ہے۔ انسان کی فطرت، ساخت، اور آغاز و انجام پر تفصیل ہے۔ انسان کے ماحول سے چن چن کر نشانیاں پیش کی گئی ہیں جو حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ انسان کے اخلاقی اوصاف میں سے فضائل اور قبائح کا فرق نمایاں کر کے دکھایا گیا ہے جس پر انسان کا ضمیر بھی گواہی دیتا ہے۔ جب یہ سب چیزیں اتنی واضح طور پر موجود ہیں تو

کسی اور چیز کی طرف جیسا کہ ہیومنزم، رجوع کرنا صرف بے عقلی بلکہ جہالت اور دور جاہلیت کی طرف واپسی ہے۔

مواخات (Brotherhood)

اس شق میں جس بھائی چارے کی بات ہو رہی ہے وہ انسانوں کے مابین نہیں بلکہ ہیومنز کے مابین ہے۔ عام انسانوں کی حیثیت ان ہیومنز کے سامنے جنگلی بھینسوں سے بھی کم ہے۔ یہی وہ دھول ہے جو یہ تمام انسانوں کی آنکھوں میں جھونکتے ہیں کہ ہم تمام بھائی بھائی ہیں حالانکہ اصل میں یہ لوگ خاص کر مسلمانوں کو اور ان لوگوں کو جو ہیومنزم کے لئے خطرہ ہیں جنگلی جانوروں سے بھی بدتر سمجھتے ہیں۔ کوئی مسلمان خواہ کمزور سے کمزور ایمان والا ہی کیوں نہ ہو ان کے اس معیار پر پورا نہیں اُترتا۔ اسی طرح بیسویں صدی کا بڑا سیاسی مفکر جان رالز لکھتا ہے کہ جو افراد آزادی کو قدرِ مطلق کے طور پر قبول نہیں کرتے ان کو ختم کرنا اتنا ہی ضروری ہے کہ جتنا ایک متعدی وبا (Pandemic) کا ختم کرنا لہذا آزادی کو رد کرنے والوں کو جواب دلیل سے نہیں گولی سے دیا جانا چاہیے۔ اسی طرح مسلمان، جو ہیومنزم کے اس باطل عقیدہ کے قائل نہیں، ان کا قتل کرنا، ان کی املاک کو لوٹنا، نہ صرف جائز ہے بلکہ ہیومنزم کے فروغ کے لئے ضروری ہے۔ ثانیاً، کیونکہ یہ ہیومن ہیں ہی نہیں، ان کو چارٹر آف ہیومن رائٹس کے تحت کوئی حقوق حاصل نہیں۔ انہی گمراہ کن تعلیمات اور افکار و نظریات کو پیش نظر رکھ کر مغربی ممالک اور امریکہ نے عراق و افغانستان، بوسنیا اور فلسطین کے مسلمانوں کا بلا تخصیصِ جنس بڑے پیمانے پر خود قتل عام کیا اور اس قتل عام کی پشت پر مالی، سیاسی، سفارتی، عسکری اور اخلاقی معاونت کے لئے ہمیشہ کمربستہ رہے۔ اپنے اس گھناؤنے عمل پر کبھی کسی پشیمانی، پچھتاوے کا اظہار نہیں کیا۔ اسی طرح گوانتاناموبے اور ابوغریب میں مسلمان مجاہدین پر ذہنی، نفسیاتی اور جسمانی روح فرسا تشدد کیا گیا کیونکہ یہ مسلمان آزادی کے قائل نہیں بلکہ رب تعالیٰ کی سچی اور حقیقی بندگی اور رسول کریم ﷺ کی اطاعت و فرمابرداری کی راہ کو حق سمجھتے اور جانتے ہیں۔ لہذا ان مجاہدین کو سگریٹ سے داغنا، کرنٹ لگانا، ان کی کھال اُدھیڑنا، ان کو جلانا، اپنا پیشاب پینے پر مجبور کرنا، ان کے ساتھ استہزاء اور ٹھٹا کرنا، اِن کے

بچوں کو قتل کرنا، ان کی خواتین کی عصمت دری کرنا، ان کے بزرگوں کی توہین کرنا، اس لیے جائز ہو جاتا ہے کہ یہ مغرب کی نظر میں انسان ہی نہیں ہیں۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص یا قوم اسلام قبول کر کے مسلمان نہیں ہوتی تو وہ لازماً یا تو محارب ہو گی یا معاہد (اہل ذمہ) ہو گی اور ان دونوں کے حقوق ہیں جو اسلامی کتب فقہ میں مذکور ہیں۔ اگر کسی سے وجہ کوئی شخص یا قوم ان دونوں گروہوں میں شامل نہ بھی ہو تو اس کی حیثیت غیر معاہد محفوظ گروہ کی لازماً رہے گی جس کو کسی بھی صورت میں نقصان پہنچانے کی اجازت نہیں ہو سکتی جبکہ مغربی فکر و فلسفہ میں یا تو آپ ہیومن بیئنگ ہیں یا جنگلی درندے جنہیں بغیر کسی تخصیص کے ہر وقت ہر جگہ اور بغیر کسی عذر کے فنا کے گھاٹ اتارا جا سکتا ہے۔ لہٰذا انسانی حقوق کا مطلب انسان کا جانوروں اور دوسری مخلوقات کے مقابلہ میں حقوق کا تصور نہیں ہے بلکہ یہ حقوق خود مختار اور اپنی خدائی کا اعلان کرنے والے انسان کا ان انسانوں کے مقابلے میں حقوق کا نظریہ ہے جو اپنی عبدیت پر اصرار اور آزادی کا انکار کرتے ہیں۔

اس لیے ہمارے یہاں وہ تمام ادارے اور تنظیمات جو حقوق انسانی کی علمبردار بنے ہوئے ہیں اور حقوق انسان اور حقوق العباد کو یکساں سمجھتے ہیں انہیں اس ضمن میں اپنی غلط فہمی جتنی جلدی ممکن ہو دور کر لینی چاہیے ورنہ وہ اپنے آپ کو انسان سمجھتے رہیں گے جبکہ مغرب اُن کو جانور سمجھنے پر بھی راضی نہیں ہو گا کیونکہ مغرب کی نظر میں جانوروں کے بھی اچھے خاصے حقوق ہوا کرتے ہیں جنہیں وہ ادا کرنا ضروری خیال کرتے ہیں اور ان کو قتل کرنا سنگین جرم و ظلم گردانتے ہیں جبکہ مسلمانوں کو اور ہر وہ شخص جو ہیومنزم کے نظریہ کا مخالف ہے اس کے قتل عام کو صحیح بلکہ ضروری سمجھتے ہیں۔

اختتامیہ

مذکورہ بالا گفتگو جسے ہم نے یونیورسل ڈیکلیریشن آف ہیومن رائٹز کی شقِ اول کی وضاحت کے طور پر پیش کر کے یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ اس شق میں بظاہر ان اصطلاحات کو استعمال کیا گیا ہے جن کے حقیقی معنی و مفہوم سے سوائے ان لوگوں کے جنہیں اللہ تعالیٰ نے مغربی فکر و فلسفہ سمجھنے کی خصوصی صلاحیت سے بہرہ مند فرمایا ہے عمومی طور پر عام پڑھے

لکھے لوگ دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ اس ڈکلیئریشن کو پوری انسانیت کی خیر خواہی پر محمول کرتے ہوئے اسے قبول کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے لیے ہر ممکن طریقے سے زور لگاتے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس ڈکلیئریشن کی ہر اصطلاح اپنے معنی مفہوم اور مطلب کے لحاظ سے ان اسلامی اصطلاحات کی ضد ہے جنہیں مسلمان جانتے اور مانتے ہیں۔ یہ اصطلاحات کا وہ فریب اور دھوکہ ہے جس میں زندگی کا معنی موت، دوا کا مطلب زہر، شفا کا مطلب مرض اور خیر کا مطلب شر ہے۔

آج پوری دنیا میں مسلمان ممالک بڑے فخر سے حقوق انسانی کے چارٹر کو حقوق العباد کا مجموعہ یا مترادف سمجھ کر قبول بھی کرتے ہیں اور اُس کی تعریف میں زمین و آسماں کے قلابے بھی ملاتے ہیں حالانکہ حقوق انسانی اور حقوق العباد میں بہت بڑا اصولی فرق ہے۔ بعض لوگ اپنی لاعلمی یا عدم توجہی کے باعث یہاں تک دعویٰ کر بیٹھے ہیں کہ اقوام متحدہ کا عالمی منشور برائے حقوق انسانی (Charter of Human rights) شاید خطبۂ حجۃ الوداع Last Sermon of The Holy Prophet ﷺ سے ماخوذ ہے۔ ایسا ہرگز نہیں کیونکہ حقوق کے تناظر میں چند چیزیں آپس میں یقیناً ملتی جلتی ہیں جس سے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ شاید حقوق انسانی اور حقوق العباد میں کوئی فرق نہیں حالانکہ یہ سمجھنا ایک بڑی علمی، فکری اور نظریاتی بلکہ اعتقادی غلطی ہے۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ حقوق العباد بندوں کے دوسرے بندوں کے حوالے سے اُن فرائض اور واجبات کا نام ہے جس کا تعین بندوں نے نہیں کیا بلکہ رب تعالیٰ نے خود یا پھر اپنے نبی آخر الزماں کے ذریعے فرمایا لہٰذا ان حقوق کی حیثیت غیر متبدل اور الہامی ہے جس میں تنسیخ، ترمیم و اضافے کا حق کسی انسان یا ادارے کو ہرگز حاصل نہیں ہے ان حقوق کی حیثیت اسی طرح ہے جس طرح اسلام میں فرائض و عبادات کا مجموعہ غیر متبدل بنیادوں پر قائم ہے۔ انسانوں کا قلیل یا کثیر، بے اختیار یا با اختیار اور کم عقل یا بہت زیادہ عقلمند گروہ مل کر بھی اس مجموعے میں رتی برابر تبدیلی نہیں کر سکتے۔ اسی طرح دنیا کی کسی پارلیمینٹ یا عدلیہ کو یہ حق حاصل نہیں ہو سکتا کہ وہ اسلام کے پیش کردہ حقوق العباد کے تصور اور تعلیم کے متبادل کسی اور فلسفے یا تعلیمات کے مجموعے کو حقوق العباد کے نام سے پیش کرے۔

گروہی عصبیت کا سراب

جاوید اکبر انصاری

گروہی عصبیت کیا ہے

انسانی حیات گروہوں (communities) میں گزاری جاتی ہے۔ گروہ (کمیونٹی) اس تعلقاتی نظام کو کہتے ہیں جس میں انفرادیت نہ صرف یہ کہ لامحالہ پیوست ہوتی ہے بلکہ اس سے متشکل بھی ہوتی ہے۔ رائج شدہ تہذیبی نظام اپنے اندر پائے جانے والے گروہوں کی ماہیت متعین کرتا ہے۔ مسلم دنیا میں پائے جانے والے قبیلے سرمایہ دارانہ انٹرسٹ گروپ / مفاداتی گروہ نہیں ہوتے۔ لیکن گروہیت (communitarian) کے علمبردار مکاتب فکر کا تصور ہیومنٹی بنی نو آدم کو ایک نسلی اکائی تصور کرتا ہے۔ ہیومن ازم انسان پرستی کا دوسرا نام ہے اور انسان پرستی نسل پرستی کی بدترین شکل ہے۔

ہیومن ازم کا بنیادی مفروضہ یہ ہے کہ انسان ایک ایسا جانور ہے جس کی زندگی کا واحد مقصد اپنی بائیولوجیکل / حیاتیاتی بقا کو توسیع دینا ہے۔ یہ مفروضہ کافر مادیت پرستانہ (materialist) اور تخیلاتی (idealist) مکاتب فکر میں یکساں مقبول ہے۔

مادہ پرست کفار (بالخصوص مارکسسٹ) اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ہیومن بینگ اصلاً ایک نوعی وجود (Species being) ہے یعنی وہ حیوانی نسل انسانی کا نمائندہ ہے اور گروہی زندگی اس نسلی عصبیت کے اظہار کا فطری ذریعہ ہے۔ یعنی گروہی زندگی ہیومن بینگ کے ادراک اور ارادے میں اس خیال کو مقدم کرتی ہے کہ اس کی بائیولوجیکل خواہشات کی تسکین کے لیے ضروری ہے کہ گروہ کی مجموعی خواہشات نفسانی کی تسکین کو فروغ دیا جائے۔

مارکسسٹ اور دیگر کافر کمیونیٹرین مفکرین ہیومن فطرت کی مفروضہ حیوانی نوعیت سے انکار نہیں کرتے۔ وہ اس کے شعور میں لازماً حرص اور ہوس کے غلبہ سے انکار نہیں کرتے لیکن ان کے خیال میں ان انفرادی فطری جبلتوں کا ریشنل اظہار گروہی زندگی میں ہوتا ہے کیونکہ

گروہی زندگی اس بات کا موقع فراہم کرتی ہے کہ انفرادی حرص و ہوس کے اظہار کی جستجو کو اجتماعی گروہی حرص و ہوس کے فروغ سے مربوط کیا جائے۔

ان کمیونیٹرین کفار کے تجزیہ کے مطابق یہی خود تخلیقیت (اٹانومی) کے حصول کا بہترین ذریعہ ہے۔ انفرادی خود مختاری (self-determination) کو گروہی خود مختاری میں ضم کیے بغیر نہ حقیقی آزادی حاصل ہو سکتی ہے نہ حقیقی معاشرتی مساوات فروغ پا سکتی ہے۔ یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ آزادی اور مساوات کا فروغ سرمایہ دارانہ عدل کے قیام کا ہدف ہے کیونکہ آزادی عبدیت کا اور مساوات ہدایت (رہنمائی کی ضرورت) کا رد ہے۔ لہٰذا کمیونیٹرین تحریکات کو سرمایہ دارانہ عدل کے حصول کے لیے جدوجہد کی تحریکیں کہہ سکتے ہیں۔

مارکسسٹ اور کچھ کافر انارکسٹ سرمایہ دارانہ نظام پر الزام لگاتے ہیں کہ وہ گروہی انتشار کو فروغ دیتا ہے اور سرمایہ دارانہ انفرادیت کو فروغ دیتا ہے۔ نوعی عصبیت کے احساس کو دباتا ہے۔ عام افراد کو تنہا، یاسیت کا شکار اور اجنبی بنا دیتا ہے اور یوں نجی سرمایہ دارانہ نظام میں جو آزادی اور مساوات فروغ پاتی ہے وہ محض فارمل (صوری) آزادی و مساوات ہوتی ہیں حقیقی نہیں ہوتیں۔ حقیقی آزادی اور مساوات کو فروغ دینے کے لیے گروہی زندگی کو معاشرتی اقتدار سونپنا ضروری ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام میں جو گروہ قائم کیا گیا وہ اجرتی مزدوروں کا گروہ تھا۔ اس گروہ کو پرولتاریہ کہتے ہیں۔ اشتراکی اور سوشل ڈیموکریٹ کافر سرمایہ داروں نے پرولتاریہ کی معاشرتی صف بندی ٹریڈ یونینوں اور کمیونسٹ اور سوشل ڈیموکریٹ پارٹیوں کے توسط سے کرنے کی کوشش کی اور پرولتاریہ کے ان گروہوں کی طرف ریاستی اقتدار منتقل کیا گیا۔

لیکن اس عمل کے نتیجہ میں نوعی ہیومن بینگ وجود میں نہیں آیا اور انفرادی خود غرضیت کا معاشرتی اظہار ابھرتا رہا یہاں تک کہ تمام سوشل ڈیموکریٹ اور کمیونسٹ ریاستوں میں نجی سرمایہ دارانہ نظام کی طرف مراجعت تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ سوویت یونین اور مشرقی یورپ میں تو کمیونسٹ ریاست بالکل تحلیل ہو گئی اور چین اور کیوبا میں پارٹی کا اقتدار قائم رکھنے کے

لیے نجی سرمایہ دارانہ معیشت اور معاشرت کے دائرہ کار کو توسیع دینا لازمی ہو گیا۔ ہر جگہ پرولتاریہ ایک اجتماعی خود شناختی گروہ (Class for itself) کی حیثیت سے تحلیل ہو گیا۔ آج ٹریڈ یونینیں اور اشتراکی پارٹیاں (کمیونسٹ اور سوشل ڈیموکریٹ) تو موجود ہیں اور اشتراکی سرمایہ دارانہ ریاستیں بھی قائم ہیں لیکن وہ کسی پرولتاریہ کے اجتماعی گروہی مفادات کی نمائندہ نہیں۔

اشتراکی مفکرین کا ایک اہم دھڑا پرولتاریہ کی جگہ کسی دوسرے ایسے معاشرتی گروہ کی نشان دہی کی کوشش کرتا ہے جو سرمایہ دارانہ اجتماعی مفادات (فروغ آزادی، مساوات اور ارتقا) کا ترجمان ہو اور جس کو بااقتدار بنا کر نوعی بشر (Species being) کو وجود میں لایا جا سکے۔ اس فکر کی سب سے واضح تشریح Istivan Meszaros کی کتاب *Beyond Leviathan* میں ملتی ہے۔ Meszaros کی فکر نے وینزویلا کے سابق صدر ہیوگو شاویز کو بے حد متاثر کیا۔ وہ *Beyond Leviathan* کو اشتراکیت کی نئی انجیل کہتا تھا اور اپنے دور اقتدار میں شاویز نے Meszaros کی فکر کی بنیاد پر ریاستی ترتیب نو کی بھرپور کوشش کی۔

وینزویلا کی گروہ بندی کی ناکام مہم

شاویز نے اپنے دور اقتدار میں وینزویلا کے پورے ملک میں مقامی آبادیوں پر مشتمل کمیونٹیز/گروہوں (communities) کا ایک جال بچھا دیا اور ان گروہوں کی طرف ریاستی اقتدار کی بتدریج ترسیل کی منظم سعی کی گئی۔ ریاستی جمہوری ادارتی نظام تحلیل نہیں کیا گیا بلکہ دستوری اصلاح کے ذریعہ اس ریاستی نظام کے ساتھ ایک مساوی کمیونوں کا نظام قائم کیا گیا جس کی طرف ریاستی اقتدار بتدریج منتقل کیے جانے کا انتظام کیا گیا۔ کمیونوں کے اس نظام کی تشکیل بھی جمہوری خطوط پر مرتب کی گئی۔ روایتی ریاستی جمہوری عمل کمیونوں کی طرف ترسیل اقتدار کی رفتار کو مستقل (بالخصوص شاویز کی موت ۲۰۱۳ء کے بعد سے) سست کرتا رہا ہے۔

شاویز کی کمیونٹیرین تحریک میکسیکو کے Subcomandante Marcos کی زپاتیستا (Zapatista) تحریک سے ان معنوں میں ہم آہنگ تھی کہ وہ اس خلا کو پر کرنے کی ایک کوشش تھی جو روایتی جمہوری نظام میں عوام کی سرمایہ دارانہ محرومیوں کا باعث ہے اور جن کی نشان دہی زپاتیستا تحریک اپنی جدوجہد کے ذریعے کر چکی تھی۔

وینزویلا میں قائم شدہ کمیون اصولاً خود مختار اور روایتی اقتداری نظام کی گرفت سے باہر تھیں۔ شاویز کو توقع تھی کہ یہ اصولاً آزاد اور خود مختار مقامی اجتماعیتیں بتدریج ایک ایسا معاشرتی، معاشی اور ریاستی نظام قائم کریں گی جہاں سرمایہ دارانہ عدل فروغ پائے گا۔ انفرادی خود غرضیاں معدوم ہوتی چلی جائیں گی اور اجتماعی سرمایہ دارانہ مادی مفادات (حصول آزادی، مساوات اور ارتقا) کو فروغ دینے کی راہ ہموار ہوتی چلی جائے گی۔

آج شاویز کے پیروکاروں کو خود اس کا احساس ہے کہ یہ امیدیں پوری نہ ہو سکیں۔ کمیون اپنی مفروضہ خود مختاری کے باوجود نجی سرمایہ دارانہ نظم معیشت اور معاشرت میں ضم ہوتا جا رہا ہے اور کمیون میں جو انفرادیت پرورش پا رہی ہے وہ نوعی انفرادیت نہیں کہی جا سکتی۔

اس بات کو واضح کرنے کے لیے کمیون میں رائج شدہ نظم معاشرت کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ ہم وینزویلا کے سب سے بڑے کمیون El Maizal میں پائے جانے والے حالات کا جائزہ لیں گے۔ El Maizal میں بڑے پیمانے پر مکئی (corn) کی کاشت کاری اور بھینسوں کی گلہ بانی کا کام منظم کیا جاتا ہے۔ پچھلے دو سال (۲۰۲۱ء تا ۲۰۲۳ء) سے وہاں کا قائم شدہ کمیونل / گروہی معاشی نظام مشکلات کا شکار ہے اور اس کا سربراہ Angel Prado اس کی ترتیب نو کی جستجو کر رہا ہے۔ وہ El Maizal میں اسی نوعیت کے سرمایہ دارانہ کو آپریٹو قائم کرنے کی جستجو کر رہا ہے جو برازیل کے مارکسسٹ ورکرز (land less worker movement) نے قائم کیے ہیں۔ El Maizal میں سرمایہ دارانہ اجرتی نظام قائم ہے لیکن وہاں کئی سالوں سے پیداواری (productivity) رجحان میں کمی واقع ہو رہی ہے۔ Prado کی مجوزہ کو آپریٹو اسکیم سوروں کی افزائش (Pig farming) نسل کو فروغ

دینے پر مرکوز ہے۔

پیداواری رجحان میں ابتری وینزویلا کے بیشتر کمیونز کا مشترکہ مسئلہ ہے۔ وینزویلا کی وزارت تجارت نے حال ہی میں ایک کمیونل دائراتی نظام (communal circuit) قائم کیا ہے جس کے تحت ملک بھر میں پھیلے ہوئے کمیونز کی پیداوار کی تجارت کی جاتی ہے۔ لیکن یہ ترسیلی نظام بھی سرمایہ دارانہ مارکیٹوں سے متصل ہے اور حکومت سرمایہ دارانہ مارکیٹوں سے خوردنی تیل اور چاول خریدتی ہے اور کمیونل سرکٹ میں قیمتوں کا تعین بھی سرمایہ دارانہ مارکیٹی قیمتوں کی بنیاد پر متعین کیا جاتا ہے۔ El Maizal اس ترسیلی نظام کا علاقائی مرکز ہے۔ نظام کے توسط سے بیچا اور خریدے جانے والا زیادہ تر مال نجی سرمایہ دار ہی فراہم کرتے ہیں۔ کمیونل انتظامیہ کے ماتحت مل Leander نجی سرمایہ کار کھیتوں سے فراہم کردہ خام مال پر انحصار کرتی ہے۔ وینزویلا کی ایک اہم پیداوار کافی (coffee) کی تجارت خالصتاً سرمایہ دارانہ خطوط پر منظم ہے اور اس کا کمیونل ترسیلی نظام سے کوئی تعلق نہیں۔

پیداواری سکت میں انحطاط صرف El Maizal کا مسئلہ نہیں وینزویلا کے پورے کومیونل نظام کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ ۲۰۲۳ء میں مکئی maize کی پیداوار ملک بھر میں ۹۰ فیصد گری۔ اجناس کو پیسنے والی ملیں کلیتاً نجی سرمایہ کارانہ فراہم کردہ خام مال پر انحصار کرنے لگی ہیں اور کمیونل ترسیل کا نظام قائم ہوتے ہی دفتریت (بیوروکریٹائزیشن) کا شکار ہو گیا ہے اور اس ترسیلی نظام کا ربط کمیونز سے منقطع ہوتا جا رہا ہے۔ کمیونز دیہی علاقوں تک محدود ہو گئے ہیں اور کومیونل شہر بسانے کی مہم بری طرح سے ناکام ہو گئی ہے۔

El Maizal ور دوسرے کمیونز میں پیداواری سکت میں کمی کی ایک بڑی وجہ وہاں کے باشندوں کی کاشت کاری اور گلہ بانی سے بیزاری اور عدم دلچسپی بھی ہے۔ یہ واضح ہے کہ کمیونز میں اجتماعی نوعی انفرادیت قائم نہیں ہو رہی۔ خود El Maizal کا بانی رہنما سرمایہ دارانہ ریاستی نظام کا حصہ بن گیا ہے۔ اس نے ۲۰۲۲ء میں نہایت انہماک اور تگ و دو سے El Maizal سے متصل شہر کی میئرشپ کا انتخاب لڑا اور کامیاب ہونے کے بعد اپنا زیادہ تر

وقت اور توجہ لوکل انتظامیہ کے مسائل طے کرنے پر مرکوز کرتا ہے۔ عملاً El Maizal لوکل گورنمنٹ کے تابع ہوتا جارہا ہے۔El Maizal کے مخلص کارکن میئر کے دفتر کے ملازمین بنادیے گئے ہیں۔ ان کمیونارڈز (کمونار دہا) کو اراضی دی جارہی ہے۔El Maizal کے رہنما Prado نے ۲۰۲۴ء میں جو نیا منصوبہ بنایا ہے اس کے مطابق چیدہ چیدہ کارکنان کو خاندانی پلاٹ عطا کیے جائیں گے۔ وہ نجی سرمایہ دار بنادیے جائیں گے۔ اور توقع ہے کہ اس سے پیداواریت (productivity) میں اضافہ ہوگا۔

عملاً یہ کمیونل ملکیت کی تحدید ہے۔ کمیونل ملکیت کو سرمایہ دارانہ نجی ملکیت میں ضم کیا جارہا ہے۔ یہ سرمایہ دارانہ نجی ملکیت کو سرمایہ دارانہ اجتماعی ملکیت میں ڈھالنے کا طریقہ نہیں بلکہ سرمایہ دارانہ نجی ملکیت کے نظاماتی تسلط کو فروغ دینے کا طریقہ ہے۔ اس سے سرمایہ دارانہ اجتماعی انفرادیت فروغ نہیں پائے گی بلکہ سرمایہ دارانہ نجی انفرادیت مستحکم ہوگی۔ اس قسم کے تجربات سابق یوگوسلاویہ اور ۱۹۵۶ء کے دوران چین کی Hundred Flowers Movement میں ناکام ثابت ہو چکے ہیں۔ گو کہ ان دونوں جگہ ریاستی سرمایہ دارانہ ملکیت کو نہ کہ کمیونل سرمایہ دارانہ ملکیت کو نجی سرمایہ دارانہ ملکیت سے متصل کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

عملاً El Maizal کمیون کو Prado کی میئرشپ کی بھینٹ چڑھایا جارہا ہے۔ ۲۰۲۲ء کی انتخابی مہم میں El Maizal سے حاصل شدہ مالی وسائل کا بے دریغ استعمال کیا گیا۔ سرمایہ دارانہ عقلیت (ریشنلٹی) اور روحانیت نوعی انفرادیت کے مجموعی اظہار کی راہ ہموار نہیں کرتی۔ مجموعی سطح پر حرص اور ہوس کا اظہار خود غرضانہ ہی رہتا ہے اور ذاتی سرمایہ درانہ مفاد کی جستجو میں مسابقت کے ذریعہ competition سرمایہ کے ارتکاز کو مہمیز دیتی رہتی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں پیداواری سکت کو بڑھانے کا فطری طریقہ انفرادی خود غرضیوں کو فروغ دینے کے مواقع فراہم کرنا ہی ہے۔

El Maizal میں پائے جانے والے پیداواری اضمحلال کو رفع کرنے کا اور انفرادی

پیداواری رجحان کو فروغ دینے کا فطری طریقہ کمیونل سرمایہ دارانہ ملکیت کو نجی سرمایہ دارانہ ملکیت میں ضم کرنا ہی ہے اور یہ جمہوری عمل کی توسیع کا متقاضی ہے۔ لہٰذا Prado کی مجوزہ اصطلاحات میں نئی ابھرتی ہوئی ملکیتی نظام کی جمہوری ادارہ سازی پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ Prado کی یہ نئی اسکیم جو انہوں نے ۲۰۲۴ء میں پیش کی تجرباتی ہے۔ پورے El Maizal میں دھیرے دھیرے نافذ کی جائے گی۔ نجی سرمایہ دارانہ ملکیت کو کمیونل سرمایہ دارانہ ملکیت سے ہم آہنگ کر کے اس کی جمہوری نگہداشت ضروری ہے اور جمہوری عمل سے توقع ہے کہ وہ انفرادی پیداواری حوصلہ افزائی کو اس طرح مینج / منظم کرے گا جس سے انفرادی خود غرضی کا اظہار اجتماعی سرمایہ دارانہ مفادات کے حصول کو منفی طور پر متاثر نہ کرے۔ کمیون میں جاری عمل کو عریاں پرستی Feminism اور عالم گیریت کی تحریکات سے وابستہ کیا جائے گا۔ یعنی نئے کمیون میں احساسِ نوعی انفرادیت عموماً فطری طور پر نہیں ابھرتا اس کو جمہوری عمل کے ذریعے بتدریج تعمیر کرنے کی جدوجہد کی جائے گی۔

وینزویلا میں ۲۰۰۹ء سے قائم ہونے والا کمیونل نظام ناکام ہو گیا ہے۔ اس کے ذریعے سرمایہ داری کی مفروضہ نوعی انفرادیت (Species being) قائم نہ ہو سکی۔ وینزویلا میں رائج شدہ جمہوری عمل اس کا واضح ثبوت ہے۔ جہاں ہر قومی انتخاب میں مقتدر جماعت کو دھاندلی کرنے کی ضرورت پڑتی ہے اور جہاں کمیونل نظام دیہی علاقوں تک محدود ہو گیا ہے اور وہاں بھی نجی سرمایہ دارانہ ملکیت میں ضم ہو رہا ہے۔

گروہی عصبیت اور اسلامی انقلاب

گروہ معاشرتی نظم ہیں۔ اسلامی معاشرت نے جو گروہ تعمیر کیے وہ خاندان، برادریوں اور قبائل پر مشتمل ہیں۔ سرمایہ دارانہ معاشرت نے جو گروہ تعمیر کیے وہ قومیتوں، اجرتی مزدوروں، مفاداتی صف بندیوں، طبقاتی اشرافیہ اور دانش وروں پر مشتمل ہیں۔

گروہ معاشرہ میں رائج شدہ انفرادیت کا مظہر ہوتے ہیں۔ خود رائج شدہ اخلاقیات اور روحانیت کو تشکیل نہیں دیتے۔ انسان ان معنوں میں نوعی بشر نہیں کہ اسے کسی مخصوص

نسل سے وابستگی کا فطری جذبہ اور احساس ہو۔ ہر انسان میں ملکوتی اور بہیمی قوتیں اور صفات موجود ہیں۔ انسانیت دو امتوں میں تقسیم ہے۔ امت اسلامیہ اور امت کفر۔ امت کفر کے ہر گروہ میں بہیمیت (وحشت) ملکوتیت پر غالب ہے۔ اس لیے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کفر کو ایک امت کہا ہے۔ عیسائی، یہودی، ہندو، لبرل، اشتراکی، قوم پرست، انارکسٹ سب امت کفر میں شامل ہیں۔ یہ سب وحشی ہیں اور اس وحشت کا سب سے واضح اظہار جاہلی علم سائیکالوجی اور ڈارونی نظریۂ ارتقا میں پایا جاتا ہے۔

امت کفر میں تعمیر شدہ انفرادیت حرص وہوس سے مغلوب انفرادیت ہوتی ہے۔ یہ سرمایہ دارانہ انفرادیت ہے۔ سرمایہ دارانہ فرد اور ان افراد کی بنیاد پر قائم شدہ تمام گروہ قومیتیں، طبقات، مفاداتی جتھے وحشی یعنی حرص اور حسد سے مغلوب ہوتے ہیں۔

امت مسلمہ انسانیت کا وہ حصہ ہے جس میں اصولاً صفات ملکوتی کو صفات بہائم پر غالب ہونا چاہیے۔ ملکوتی صفات کے غلبہ کا اظہار اسلامی انفرادیت اور اسلامی گروہوں خاندان، قبیلہ، برادری، محلہ دونوں میں ہونا چاہیے۔ لیکن فی الحال ایسا نہیں ہے۔ اسلامی انفرادیت اور اسلامی گروہ بندی سرمایہ دارانہ تغلب کے نرغے میں ہیں اور اسلامی انفرادی اور گروہی زندگی سرمایہ دارانہ نفوذ سے مجروح ہوگئی ہے۔

اسلامی انفرادیت اور گروہ بندی کی سرمایہ کاری کا عمل سامراج کے توسط سے عمل میں آیا۔ انیسویں صدی میں سامراج نے تمام اسلامی ریاستیں منہدم کر دیں اور ۱۹۵۰ء کی دہائی کے بعد سے مسلم دنیا میں جو ریاستیں قائم ہوئیں وہ خالص دہریہ سرمایہ دار باج گزار ریاستیں تھیں اور ہیں۔ ان دہریہ ریاستوں کی معاشرتی، سیاسی اور معاشی حکمت عملی کے ذریعہ انفرادیت اور گروہ بندیوں کو سرمایہ دارانہ خطوط پر مرتب کرنے کی کوشش جاری رکھی۔

لیکن الحمدللہ کسی بھی مسلم ملک میں یہ کوشش پورے طور پر کامیاب نہیں ہوئی اور ہر مسلم ملک میں (شاید بوسنیا اور البانیا کے علاوہ) مخلصین دین کی ایک ایسی بڑی تعداد موجود ہے جو اپنی انفرادی اور گروہی زندگی میں اسلامی اخلاقیات اور روحانیت کا اظہار کرتے ہیں۔ ایک

محتاط اندازے کے مطابق پاکستان میں مخلصین دین کی تعداد کا مجموعی آبادی میں تناسب ۹ فیصد یعنی دو کروڑ ہے۔ اس کے علاوہ الحمد للہ دو اسلامی ریاستیں ایران اور افغانستان بھی قائم کر لی گئی ہیں جہاں مخلصین دین مظلوم نہیں اور جہاں ریاستی نظام پر علمائے کرام کی گرفت مضبوط ہے۔

آج سامراج ہر جگہ اسلامی انقلابی جدوجہد سے مزاحم ہے۔ ایران اور افغانستان میں ریاست کی معاشرتی گرفت کو کمزور کرنا بنیادی سامراجی ہدف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ریاست معاشرہ میں غالب انفرادیت کے قیام میں فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ معاشرہ میں چند ایسے پاکیزہ نفوس ہمیشہ موجود رہتے ہیں جو اسلامی انفرادیت کا مظہر ہوتے ہیں۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کی آبادی کی ایک قلیل اقلیت ہی کا تزکیہ کیا۔ جب تک مدینہ میں اس قلیل اقلیت کو ریاستی قوت میسر نہ آئی معاشرہ کو اسلامی خطوط پر نہ ڈھالا جا سکا۔

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

یہی افغانستان میں بھی دورِ حاضر میں ہوا۔ مجاہدین کی ایک قلیل تعداد (زیادہ سے زیادہ اسی ہزار جو ملکی آبادی کا صفر اعشاریہ ڈھائی فیصد تھے) نے عدیم المثال جدوجہد کے ذریعے ریاست پر قبضہ حاصل کر لیا ہے اور آج اس ہی قلیل اقلیت کی رہنمائی میں اسلامی معاشرت فروغ پا رہی ہے۔

سامراج نے افغانستان میں ورلڈ بینک، نیٹو کے ہیومینٹیرین گروپ اور اقوام متحدہ کے اداروں کے توسط سے جو تخریب کاری کی حکمت عملی مرتب کی ہے اس کو Bottom Up Strategy کہتے ہیں۔ اس حکمت عملی کی تنفیذ کا مقصد ریاست کی معاشرتی اور گروہی گرفت کو مجروح کرنا ہے۔ افغان عوام کے اندر سرمایہ دارانہ مجبوریوں کے احساس اجاگر کئے جا رہے ہیں اور انہیں حقوق کا طلب گار بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے اور مقامی معیشتوں کو عالمی سرمایہ دارانہ مارکیٹوں سے منسلک کرنے کی اسکیمیں بنائی جا رہی ہیں۔ ان سب تدابیر کا

مقصد معاشرتی سطح پر سرمایہ دارانہ گروہ بندیوں کا فروغ ہے تاکہ سرمایہ دارانہ انفرادیت عام ہو، اسلامی انفرادیت کا معاشرتی تغلب منہدم ہو اور بالآخر ریاستِ اسلامی کی معاشرتی بنیادیں تحلیل ہو جائیں۔ Bottom Up حکمت عملی ورلڈ بینک کی مقامیت (localization) حکمت عملی کا تسلسل ہے جس کا مقصد ایشیائی اور افریقی ممالک کے مقامی گروہوں اور مفاداتی جتھوں کو ریاستی نظام سے منقطع کر کے عالمی سامراجی نظم اقتدار کا آلہ کار بنانا تھا۔

افغانستان کی اسلامی حکومت کی یہ ایک بنیادی ذمہ داری ہے کہ وہ ریاست کی معاشرتی گرفت کو مضبوط کرے۔ اسلامی معاشرت اور گروہ بندی کو مستحکم کیے بغیر اسلامی انفرادیت کا نظاماتی تغلب برقرار نہیں رکھا جا سکتا۔ اسلامی حکومت کو ایسی تمام تدابیر کو سختی سے کچل دینا چاہیے جو گروہی سطح پر سرمایہ دارانہ آزادیوں کو فروغ دیں اور مقامی گروہوں کے روابط سرمایہ دارانہ سامراجی مارکیٹوں سے استوار کرنے کی راہ ہموار کریں۔ یہ کام معاشرتی اور گروہی زندگی پر مضبوط ریاستی گرفت قائم کیے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔

ایرانی معاشرتی زندگی پر سامراجی سرمایہ دارانہ گرفت افغانستان کے مقابلے میں زیادہ مضبوط ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انقلابی تحریک (۱۹۷۰ء – ۱۹۷۹ء) کے دوران دہریہ (اشتراکی، لبرل، قوم پرست) جتھے اسلامی حلقوں کے ساتھ شریک تھے۔ گو کہ ان دہریوں کو اقتدار نہیں ملا لیکن جو جمہوری نظام قائم ہوا اس میں ان کی شمولیت کے مواقع موجود تھے اور ہیں۔ ان مواقع سے یہ جتھے فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں اور ان کا اثر اتنا گہرا ہے کہ اصلاح پسند علما کا ایک گروہ بھی ان کا ہمنوا ہو کر سرمایہ دارانہ آزادیوں کے معاشرتی فروغ کی وکالت کرتا نظر آتا ہے۔ ریپبلکن نظم دستوریت کی بتدریج تحلیل اور امارت اسلامیہ ایران کی طرف بتدریج مراجعت دہریہ قوتوں کی معاشرتی گرفت کو کمزور کرنے اور سرمایہ دارانہ گروہ بندیوں کے فروغ کی راہ مسدود کرنے کے لیے ضروری ہے۔

پھر ایران میں معاشرتی زندگی کی سرمایہ کاری کا خطرہ ایک نہایت طاقت ور اور دیرپا فیمینسٹ (عریاں پرستی) تحریک کی کارفرمائی سے ہے جو تحریک انقلاب اسلامی کی سب سے حوصلہ

مند اور کڑی مخالف ہے اور اس کے ثقافتی اثرات ایرانی کلچر، آرٹ، ادبیات، فلم میں نہایت گہرے ہیں۔ فحش نوازی (فیمی نزم) تحریک کے عروج کا ایک اہم سبب وہ ڈھیل ہے جو حکمران علما نے عورتوں کے پبلک لائف میں شمولیت کے بارے میں اختیار کی ہوئی ہے۔ آج اعلیٰ تعلیمی اداروں میں مخلوط تعلیم دی جارہی ہے اور وہاں خواتین کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے۔ فوج میں بڑے پیمانے پر عورتیں بھرتی کی جارہی ہیں۔ مانع حمل مہمات کے احیاء کی سفارشات پیش کی جارہی ہیں جن کی آڑ میں شہوت رانی (یہاں تک کہ اغلام بازی) فروغ پا رہی ہے۔ جب تک پبلک لائف میں عورتوں کی شمولیت سے متعلق پالیسی تبدیل نہیں کی جائے گی اس وقت تک سرمایہ دارانہ انفرادیت کے فروغ کے امکانات موجود رہیں گے اور اسلامی ریاست کی معاشرتی گرفت ڈھیلی پڑتی جائے گی۔

جن مسلم اکثریتی ممالک میں ریاست قائم نہیں ہے وہاں کی حکومتیں سامراجی قوتوں سے مل کر گروہی زندگی میں سرمایہ دارانہ معاشرت کو فروغ دینے کی کوشش کررہی ہیں۔ ان ممالک کی معاشرتی اور گروہی زندگی اسلامی اور دہریہ رواج کا امتزاج ہے۔ ان تمام ممالک میں مدت دراز تک سامراجی ریاستوں کا تسلط رہا اور اس تسلط کے خاتمہ پر جو ریاستیں قائم کی گئیں وہ بھی سامراج کی باجگزار سرمایہ دارانہ ریاستیں ہیں۔ ان باجگزار دہریہ ریاستوں کے بااقتدار رہنے کے لیے ضروری ہے کہ سرمایہ دارانہ گروہ بندی اور انفرادیت معاشرتی غلبہ حاصل کرے۔

ان غیر اسلامی مسلم ریاستوں میں سرمایہ دارانہ انفرادیت اور گروہ بندی کے خلاف اسلامی جدوجہد غیر مربوط اور کمزور ہے۔ ان ممالک میں مخلصین دین کی تعداد محدود نہیں مثلاً پاکستان میں ایسے افراد جو اسلامی انفرادیت کے حامل ہیں (یعنی مخلصین دین) تقریباً دو ڈھائی کروڑ ہیں لیکن ان کی اسلامی انفرادیت کا اظہار عموماً ذاتی زندگی کے دائرہ تک محدود رہتا ہے۔ پبلک لائف میں مخلصین دین بے بس اور بے اختیار ہیں اور عموماً اس بے بسی کو ناگزیر سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ان ممالک میں پائی جانے والی اسلامی تحریکات مخلصین دین کی ریاستی بے بسی کو رفع کرنے کی جدوجہد نہیں کر رہی ہیں، ان تحریکوں نے عملاً سرمایہ دارانہ نظاماتی تغلب سے سمجھوتا کر لیا ہے اور ان کا مفروضہ ہے کہ معاشرتی زندگی کے کسی ایک پہلو (تعلیم، تزکیہ، سوشل ورک) کی اصلاح خود بہ خود اور غیر ارادی طور پر کلی اسلامی نظام کے قیام کا ذریعہ بن جائے گی۔ یہ تحریکیں عملاً جہاد سے پہلو تہی اختیار کرتی ہیں اور مسلم دنیا میں قائم دہریہ ریاستوں کو اسلامی ریاستیں گردانتی ہیں۔ یہ سرمایہ داری کے انہدام کی نہیں اس کی ناممکن اسلام کاری کی ایسی تحریکیں ہیں جو سترھویں صدی میں سرمایہ داری کی عیسائیت کاری کرنے کے لیے انگلینڈ اور سوئٹزرلینڈ میں برپا کی گئی تھیں۔

غیر اسلامی مسلم اکثریتی ممالک میں سرمایہ دارانہ انفرادیت اور سرمایہ دارانہ گروہ بندی کو شکست دینے کے لیے مخلصین دین اور عوام کی تعلیم اور تزکیہ نفس کافی نہیں۔ ہمیں مخلصین دین کی نظاماتی بے بسی کو دور کرنے کے لیے موثر منصوبہ بندی کرنا پڑے گی تاکہ مخلصین دین بااختیار ہو کر ایسی اسلامی ریاستیں قائم کریں جن کے تسلط کے نتیجہ میں اسلامی انفرادیت اور معاشرت فروغ پائے۔ اسلامی ریاست کے قیام کے کی انقلابی جدوجہد کے بغیر اسلامی انفرادیت اور معاشرت کا عمومی فروغ ناممکن ہے۔

کیا عوامی خواہشات کی تکمیل کی جدوجہد اقامت دین کا ذریعہ بن سکتی ہے؟

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

وجود اور خواہشات

انسانی وجود کی دو جہتیں ہیں۔ حیوانی اور ملکوتی (اس کی تفصیل شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں بیان فرمائی ہے)۔

حیوانی وجود نفس امارہ کے تابع ہوتا ہے اور نفس لوامہ کی حرکیت کو نفس امارہ کے احکامات کی تکمیل کا ذریعہ بنالیتا ہے۔ سرمایہ دارانہ طرز حیات اختیار کرنے والے افراد اپنے نفس امارہ کے ایسے احکامات کی تعمیل مقدم تصور کرتے ہیں جن کو ریشنلائز کیا جاسکے یعنی جن کی تکمیل کے لیے آفاقی (universalizable) اصول مرتب کیے جاسکیں۔ ریشنل ازم کسی ملکوتی وجود کو تسلیم نہیں کرتی۔ وہ اللہ تعالیٰ کو شارع نہیں مانتی۔

سرمایہ دارانہ تصورِ حیات خالص دنیاوی ہے۔ وہ حیات بعد الموت اور اس سے منسلک علمیت کو صریحاً رد کرتی ہے۔ اس کا تصور انسانیت ہیومنٹی (humanity) ہے اور ہیومن بینگ (جو بقول فوکالٹ سولھویں صدی عیسوی سے پہلے ناپید تھا) ان معنوں میں خود تخلیقی ہے کہ وہ اپنے لیے پیمانۂ خیر وشر خود تخلیق کرتا ہے۔ حق وہ ہے جو سرمایہ دار کی ریشنل خواہشات (یعنی ایسی خواہشات جن کی بنیاد پر آفاقی universalizable اصول اخذ کیے جاسکیں) کی تکمیل کو ممکن بنائے اور باطل وہ ہے جو ریشنل خواہشات کی تکمیل میں مزاحم ہو۔

چونکہ سرمایہ دار بزعم خود خیر وشر کی تخلیق کا واحد جائز مکلف ہے اور چونکہ تخلیق کاری کا یہ عمل ضوابطی (procedural) ہے جوہری substantive نہیں ہے لہٰذا کوئی عمل فی نفسہٖ خیر یا شر قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ اس کے خیر یا شر ہونے کا دارومدار اس کی ادائیگی

پر منحصر ہے یعنی اس بات پر کہ اس عمل کی انجام دہی کے نتیجہ میں مساوی آزادی / خود مختاری فروغ پاتی ہے یا نہیں۔

مثلاً جوا کھیلنے کا عمل نہ بذات خود خیر ہے نہ شر بلکہ اس کا خیر یا شر قرار دیا جانا اس بات پر منحصر ہے کہ جس ضابطہ (Procedure) کے تحت جوا کھیلا جارہا ہے وہ تمام کھلاڑیوں کو اپنی انفرادی مساوی آزادی اور خود مختاری کا یکساں موقع فراہم کرتا ہے یا نہیں کرتا۔

یعنی سرمایہ داری مساوی آزادی کو خیر مطلق قرار دیتی ہے۔ یعنی اصولاً (عملاً نہیں) بنیادی سرمایہ دارانہ حق حقِ خود ارادیت ہے۔ ہر ہیومن بینگ کا یہ حق اور فرض ہے کہ وہ خیر و شر کا تعین خود کرے اور چونکہ ہیومن بینگ / سرمایہ دار کسی ملکوتی عالم اور کسی آخرت کے وجود کا قائل نہیں لہٰذا وہ اس بات پر مجبور ہے کہ خیر و شر کا جو پیمانہ وہ متعین کرے وہ اس کی دنیاوی انسانی خواہشات کے حصول (دولت و قوت) کے تابع ہو۔ اصولاً ہیومن بینگ خیر و شر کا کوئی تصور بھی اختیار کر سکتا ہے لیکن عملاً اس کا تصور حیات (جو آخرت کے انکار کا متقاضی ہے) اس کو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ تمتع فی الارض کے حصول ہی کو خیر و شر کا پیمانہ بنائے۔ اور تمتع فی الارض بڑھوتریٔ سرمایہ (فروغ حرص و حسد) کے علاوہ کچھ نہیں۔ ہیومن بینگ اصولاً آزاد اور عملاً سرمایے (نفس امارہ کے احکامات) کی تابع داری پر مجبور ہے۔

سرمایہ دارانہ معاشرت

ان متضاد علمیاتی اور اخلاقی تصورات کی بنیاد پر مغرب میں سترھویں صدی سے جو معاشرہ تعمیر ہوا ہے وہ نہایت غلیظ، پلید اور ذلیل ہے، جیسا کہ امام محمد مارماڈیوک پکتھال رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا "مغربی تہذیب کوئی چیز نہیں۔ عیسائیت کی نیم سچائیوں کو رد کر کے مغرب وحشی ہو گیا ہے۔"

جدا ان کے دن رات کی زندگی ہے
شراب ان کی گھٹی میں گویا پڑی ہے

تعیش ہے، نفرت ہے، آوارگی ہے
غرض ہر طرح سے ان کی حالت بری ہے
اس طرح سے ان پہ گزری ہیں صدیاں
کہ چھائی ہوئی نیکیوں پہ ہیں بدیاں

مغرب کی معیشت ایک جوا خانہ بن گئی ہے۔ جہاں سٹہ بازار معاشی قدر متعین کرتا ہے۔ ان کا جمہوری نظام دھوکہ دہی، عیاری، بد دیانتی اور کرپشن کی آماج گاہ بن گیا ہے۔ ان کی معاشرت اتنی گھناؤنی اور متعفن زدہ ہوگئی ہے کہ زنا معمول اور نکاح معدوم ہوگیا ہے۔ ان کی مذہبیت اتنی مدقوق ہوگئی ہے کہ پوپ فرانسس اغلام بازی کا وکیل بن گیا ہے اور جاستین ولبی (Justin Welby) سابق اسقف اعظم کانتربری اپنی حرامی ولدیت کی تشہیر کرتا نظر آتا ہے۔ انہوں نے سولھویں صدی سے آج تک پوری دنیا میں لوٹ مار اور قتل وغارت کا بازار جاری رکھا ہوا ہے اور کروڑوں سرخ ہندیوں، ابار جنیوں (قدیم باشندگان آسٹریلیا)، افریقوں، ویت نامیوں، کمبوڈیا کے باشندوں، لاؤس کے باشندوں، عراقیوں، فلسطینیوں اور صومالیوں کو قتل کیا ہے اور کیے جارہے ہیں۔

عمل ان کے جتنے ہیں سب وحشیانہ
ہر اک لوٹ مار میں ہے یگانہ
فسادوں میں کٹتا ہے ان کا زمانہ
نہیں کوئی تہذیب کا تازیانہ
یہ ہیں قتل و غارت میں چالاک ایسے
درندے ہوں جنگل میں بے باک جیسے

یہ سب سرمایہ دارانہ اخلاقیات کے معاشرتی اور ریاستی تغلب کا نتیجہ ہے۔ پلید سرمایہ دارانہ اخلاقیات کو قبول کر کے انسان ہیومن بینگ بن جاتا ہے۔ وہ سرمایہ کی بندگی (subjectivity of Capital) قبول کر لیتا ہے اور اس کے لیے نفس مطمئنہ کا

حصول و شعور ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس کا نفس امارہ اس کے نفس لوامہ پر غالب آجاتا ہے۔ اور اس کی خواہشات نفسانی لامحدود ہوتی رہتی ہیں۔ ہیومن بینگ سرمایہ دارانہ عدل کے حصول کی تگ و دو میں لگا رہتا ہے۔

سرمایہ دارانہ عدل یہ ہے کہ ہیومن بینگ کو اس کی خواہشات نفسانی (جو کہ لامتناہی طور پر بڑھتی رہتی ہیں) کے مساوی معاشرتی مواقع فراہم کیے جائیں۔ یہ اصولاً ایک ناقابل حصول ہدف ہے۔ دنیا میں کہیں بھی سرمایہ دارانہ عدل نہ کبھی قائم ہوا ہے نہ کبھی ہو سکتا ہے۔ اس کی وجہ سرمایہ دارانہ عمل کی ارتکازیت ہے۔ سرمایہ کی بڑھوتری کو مہمیز دینے کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی ایک مقام پر مجتمع ہوتا رہے اور لامحالہ جیسے جیسے ارتکازیت بڑھتی ہے ویسے ویسے تقابلی نامساویت (relative inequality) میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ یہ اس کے باوجود ہے کہ ارتکاز سرمایہ کے نتیجہ میں حقیقی سطح غربت میں کمی آتی جاتی ہے۔ حقیقی سطح غربت کو absolute poverty کہتے ہیں۔

دورِ حاضر میں اس کی بہترین مثال چین ہے۔ چین میں ۱۹۷۹ء سے ارتکاز سرمایہ میں نہایت تیز رفتاری سے اضافہ ہوا ہے جس سے حقیقی سطح غربت تیزی سے گری۔ ۲۰۲۰ء تک ۸۰۰ ملین چینی حقیقی سطح غربت سے اوپر اٹھ گئے ہیں لیکن اسی عرصہ میں دولت اور آمدنی کی تقسیمی نامساویت برق رفتاری سے بڑھی اور آج چین میں تقابلی نامساویت تمام یورپی ممالک سے زیادہ ہے۔ آج چینی عوام تیزی سے ذہنی مریض بنتے جا رہے ہیں۔ ان میں بے چینی، غضب اور ناآسودگی تیزی سے پھیل رہی ہے۔ ان کی تاریخی قومی ثقافت تباہ ہو رہی ہے اور ان کا ریاستی اور معاشرتی نظام تیزی سے سرمایہ دارانہ خطوط پر منظم ہو رہا ہے۔ یہی عمل جاپان اور کوریا میں ہوا اور آج بھارت میں بھی جاری ہے۔

پاکستان میں سرمایہ دارانہ ظلم کے خلاف جدوجہد

جماعت اسلامی پاکستان میں سرمایہ دارانہ ظلم (تقسیمی نامساویت کے فروغ) کے خلاف

جدوجہد کر رہی ہے اور امیر محترم حافظ نعیم الرحمان کے کئی بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ ان کو یہ توقع ہے کہ اس جدوجہد سے غلبۂ دین کی راہ ہموار ہو گی۔ اس غلط فہمی کو دور کرنا نہایت ضروری ہے۔

اول تو سرمایہ دارانہ ظلم کو بذریعہ احتجاج ختم کیا نہیں جا سکتا۔ سرمایہ دارانہ ظلم (تقسیمی نامساویت) کا فروغ پاکستان کی سامراجی نظام میں پیوستگی کا نتیجہ ہے جس کا اظہار آئی ایم ایف کے ہر ای ایف ایف معاہدہ کے تسلط سے ہوتا ہے اور جس کی تنسیخ کا مطالبہ نہ امیر محترم نے اور نہ کسی اور اسلامی جماعت نے کبھی بھی کیا ہے۔ پھر تقسیمی نامساویت کے فروغ کا دوسرا سبب بیرونی سرمایہ کاری ہے جس کی حوصلہ شکنی اور بیرونی ترسیل زر پر پابندی عاید کرنے کا ہمارے بیانیے میں کوئی ذکر نہیں۔ مستقبل قریب میں قائم ہونے والی ہر حکومت (خواہ مسلم لیگ و تحریک انصاف، خواہ پیپلز پارٹی کی) سامراج کی باجگزار اور بیرونی سرمایہ کاروں کی منت پذیر رہے گی۔

پھر اس سے بہت زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ ظلم (نامساویت کے فروغ) کی تخفیف کی وکالت کر کے جماعت اسلامی سرمایہ دارانہ عدل (مساوی آزادی کا فروغ) کی آلۂ کار بنتی جا رہی ہے۔ ہم عوامی نفسانیت کے فروغ کے حمایتی بنتے جا رہے ہیں۔ یہ اقامت دین کی طرف مراجعت کا طریقہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ تو سرمایہ دارانہ حقوق کے حصول کو جواز فراہم کرنے کا طریقہ ہے۔

ہماری "حق دو کراچی کو" اور "بنو قابل" کی تحریکیں جماعت اسلامی کو سرمایہ دارانہ ریاستی نظام میں سمونے کا طریقہ ہیں۔ اس نظام کے خلاف بغاوت کا راستہ نہیں ہیں۔ بالخصوص اس لیے بھی کہ یہ مہمات دستوری جکڑ بندیوں میں مقید ہیں۔ ریاست جماعت پر حملہ آور ہے اور اس پر ڈیپ اسٹیٹ قبضہ کر رہی ہے۔ ہم عوامی بنتے جا رہے ہیں عوام اسلامی نہیں بن رہے۔

محترم امیر جماعت فرماتے ہیں کہ ہم ابھی نظاماتی تبدیلی لانے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ یہ

بات درست ہے اور ۱۹۷۸ء سے اب تک اس استعداد میں کمی آئی ہے۔ لیکن استعداد کی اس کمی کو دائمی طور پر قبول کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ یوں ہماری انقلابیت جو ہمارا وجہ الوجود ہے ختم ہوتی چلی جائے گی۔ ہم محض ایک سوشل ڈیموکریٹ پریشر گروپ بنتے چلے جائیں گے۔ سرمایہ دارانہ عدل کے قیام کی جستجو جماعت اسلامی کو ایک سوشل ڈیموکریٹک پریشر گروپ بناتی جارہی ہے۔

یہ مفروضہ کہ سرمایہ دارانہ ظلم کے خاتمہ کی جدوجہد غلبۂ دین کی راہ ہموار کرے گی ایک اور بنیادی مفروضہ پر قائم کیا گیا ہے جس کو ہم ۱۹۴۸ء سے آج تک متصور کرتے چلے آئے ہیں۔ وہ بنیادی مفروضہ یہ ہے کہ پاکستانی عوام نظم اجتماعی public order میں غلبۂ دین کے خواہاں اور حمایتی ہیں اور اگر وہ سرمایہ دارانہ مظالم سے نجات پا جائیں تو نظم اجتماعی کو اسلامی خطوط پر مرتب کرنے کی حمایت کریں گے۔

یہ مفروضہ حقیقت کے خلاف ہے۔ عوام کی دینی وابستگی جذباتی ہے اور اس وابستگی کا اظہار ان کی نجی زندگی تک محدود ہے۔ نجی زندگی میں بھی دینی احکام کی پابندی عوام کا ایک قلیل حصہ جسے ہم مخلصین دین کہتے ہیں، ہی کرتا ہے اور مخلصین دین بھی نظم اجتماعی میں غلبۂ دین کو ممکن نہیں سمجھتے۔ بحیثیت عمومی پاکستانی عوام اپنے آپ کو لاچار اور بے کس تصور کرتے ہیں اور ایک ایسے نجات دہندہ کی تلاش میں رہتے ہیں جو سرمایہ دارانہ عدل (یعنی تقسیمی نامساویت میں کمی کرے عوام کی لاچارگی اور بے بسی میں کمی نہیں) کو فروغ دے۔ جب تک عوام میں ایک ایسا گروہ قائم نہیں کیا جاتا جو اپنے آپ کو لاچار اور بے کس نہ سمجھے اس وقت تک ہر احتجاج اور ہر انتخاب سرمایہ دارانہ عدل کے حصول کی لاحاصل جستجو پر منتج ہوتا جائے گا۔

اسلامی انقلابی عمل وہ عمل ہے جو عوام میں سے ایک حوصلہ مند، بااختیار اور تنفیذی قوت رکھنے والا گروہ منظم کرے اور اس گروہ کی عوامی قیادت کی ادارتی صف بندی ممکن بنائے۔

پاکستان میں یہ گروہ لازماً مخلصین دین پر مشتمل ہو گا کیونکہ یہی لوگ دین سے شعوری وابستگی رکھتے ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ان کی تعداد دو ڈھائی کروڑ ہے۔ ملک کی آبادی کا نو دس فیصد۔ یہ جماعت اسلامی کا بنیادی حلقہ constituency ہے اور ہمارا عوام سے تخاطب براہ راست نہیں ہونا چاہیے بلکہ اسی حلقے کے ذریعہ ہونا چاہیے۔ یہ بہت بڑا حلقہ constituency ہے اور اس کو منظم کرنے کا ادارتی ڈھانچہ لاکھوں مساجد کی شکل میں پورے ملک میں پھیلا ہوا ہے۔

مری جدوجہد کی بالیقیں بنیاد ہے مسجد
خدا آباد رکھے آج بھی آباد ہے مسجد

مخلصین دین کو بااقتدار بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ان میں پائے جانے والے مسلکی گروہوں میں اتحاد پیدا کیا جائے۔ غیر مسلکی اسلام کوئی چیز نہیں اور مسلکی افتراق رحمت ہے لیکن مسلکی تصادم کو سامراج نے فروغ دیا اور اس تصادم کے جاری رہنے کی ایک بڑی وجہ نظم اجتماعی میں مسلکی جماعتوں کا اسلامی تشخص کے اظہار سے گریز ہے۔ دورِ حاضر میں نظم اجتماعی کی اسلامی ترتیب کے ضمن میں مسلکی اختلافات نہ ہونے کے برابر ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر مسلک کے وابستگان کو اسلامی نظم اجتماعی کی جدوجہد کی فرضیت سے آگاہ کیا جائے اور انہیں اس فرض کفایہ کی ادائیگی کی ضرورت پر راضی کیا جائے۔ ایک ملک گیر بین المسالک وفاق المساجد قائم ہو جو مخلصین دین کو مقامی سطح پر بااختیار بنانے کا ذریعہ ثابت ہو۔ سرمایہ دارانہ مظالم کے خلاف جدوجہد اسلامی عصبیت کے فروغ کی جدوجہد سے وابستہ ہو۔ حلال رزق کی فراہمی کا اور ترسیل توانائی (پانی، بجلی اور گیس وغیرہ) کا بھی انتظام کیا جائے۔ مخلصین متحد ہو کر ایک ریاست درون ریاست قائم کریں جس کی توسیع سرمایہ دارانہ نظم اجتماعی کو کمزور کرے اور ائمہ مساجد کی قیادت میں پاکستانی معاشرہ کو غیر جمہوری خطوط پر مرتب کرنے کا ذریعہ بنے۔ جماعت اسلامی کے ریاستی اقدام انتخابات اور

احتجاجات کا مقصد اس متبادل نظم اجتماعی کے دائرہ کار کی توسیع ہو۔ یوں مخلصین دین بااختیار بنتے چلے جائیں گے اور ان کے معاشرتی اقتدار کا فروغ بتدریج عوام میں احساسِ لاچارگی اور بے بسی کو رفع کرتا رہے گا۔ ان شاء اللہ۔

سرمایہ دارانہ ظلم کے خاتمہ کی جدوجہد سرمایہ دارانہ عدل کے قیام پر منتج نہیں ہوتی۔ یہ بات مشرقی یورپ اور لاطینی امریکی تجربات سے ثابت ہے۔ سرمایہ دارانہ ظلم کے خاتمہ کے لیے سرمایہ دارانہ نظام کا مکمل انہدام ضروری ہے۔

☆☆☆

کیا سرمایہ داری کی سبز کاری ممکن ہے؟

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

جاہلی علمیت سائنس کے نتیجہ میں کائناتی ماحولیاتی بحران زور پکڑ رہے ہیں۔ جس جاہلی علمیت سائنس نے چار سو سال قبل دنیا کو جنت بنانے کا خواب دکھلایا تھا وہ اس کو تیزی سے جہنم بنا رہی ہے۔ گرمی ناقابل برداشت حد تک بڑھ رہی ہے۔ ماحولیاتی کثافت عروج پر ہے۔ سمندری تیزابیت پھیل رہی ہے۔ نئے نئے امراض پیدا ہو رہے ہیں۔ ہزاروں لاکھوں حیاتیاتی نسلیں معدوم ہو چکی ہیں۔ یہ سب سرمایہ دارانہ جاہلی علمیت سائنس کی کرشمہ سازی ہے۔

کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کی فتوحات

آج سرمایہ دارانہ مدبرین کے کئی گروہ نظم اجتماعی میں اصلاح کی وکالت کر رہے ہیں۔ وہ ایسی تزویراتی حکمت عملی وضع کرنے کی جستجو کر رہے ہیں جو سرمایہ دارانہ اہداف (آزادی، مساوات، خوشحالی) کو محفوظ رکھتے ہوئے ان اہداف کے حصول کی جستجو کو تصرف فی الارض کے عمل سے ہم آہنگ کر دے۔ بڑھوتری (growth) تو جاری رہے لیکن بڑھوتری کا یہ عمل کائناتی geo-bio-chemical توازن کو درہم برہم نہ کرے۔ انفرادی زندگی پر تعیش رہے لیکن عیش پرستی کے ایسے ذرائع اور طریقے وضع کیے جائیں جو ماحولیاتی کثافت کا باعث نہ ہوں۔ فیصلہ سازی کا معاشرتی عمل تو جمہوری رہے لیکن وہ کائناتی نظاماتی حد بندیوں اور توازن (systemic environmental balances) کو ملحوظ خاطر رکھے۔ قدیم قبائلی رسوم ورواج کو سرمایہ دارانہ قالب میں ڈھالنے کی کوشش بالخصوص لاطینی امریکا میں جاری ہے۔

یہ سرمایہ داری کی سبز کاری (greening) کی جدوجہد ہے جو دو سطح پر جاری ہے۔ ایک طرف تو حکومتی اور سرکاری ادارے سبز سرمایہ داری کے نئے اہداف اور پالیسیاں وضع اور

نافذ کر رہے ہیں جو کہ بنیادی طور پر سرمایہ کارانہ عمل کے منفی ماحولیاتی اثر کو کم کرنے کے لیے نئی ٹیکنالوجیز کی ایجاد اور استعمال پر انحصار کرتی ہیں۔ دوسری جانب سرمایہ دارانہ سبز کاری ایک عوامی تحریک کی شکل اختیار کر گئی ہے جس میں متعدد طبقے نوجوان، سوشل ڈیموکریٹ، اشتراکی، فیمنسٹ اور نسلیت مخالف گروہ شامل ہیں۔ کچھ مزدور تنظیموں اور تھنک ٹینکس نے بھی ماحولیاتی ابتری روکنے کے اہداف اپنے حقوق کے منشوروں میں شامل کیے ہیں۔ اب سبز کاری ایک عالمی کاروبار کی شکل بھی اختیار کر رہی ہے اور بڑی سرمایہ کار کمپنیاں کاربن حدود کی تجارت اور سبز اشیا کی سٹہ بازی اور سرمایہ کاری میں بھی ملوث ہوتی جا رہی ہیں۔ آج ماحولیاتی ابتری کا مسئلہ لبرل ادارتی سرمایہ دارانہ سیاست کا ایک اہم جزو بن گیا ہے جو بیش تر سرمایہ دارانہ سیاسی ایجنڈوں میں کسی نہ کسی حیثیت میں شامل کر لیا گیا ہے۔

آج سرمایہ دارانہ پالیسی ساز حلقوں میں ماحولیاتی ابتری کو روکنے کی ضرورت کا احساس بڑھتا جا رہا ہے لیکن ماحولیاتی ابتری کے اسباب اور اس ابتری کو روکنے کے ذرائع کے بارے میں گہرے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ماحولیاتی بحران کا تعلق سرمایہ دارانہ نظاماتی بحرانوں (معاشی، سیاسی، سماجی) سے ہے جو پیچیدہ تر ہوتے جا رہے ہیں اور جو سب سرمایہ دارانہ نظم اور طرز حیات کے بنیادی مقاصد کے غماز ہیں۔ سرمایہ داری کا یہ بنیادی تضاد تعقلی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظم میں جو طرز زندگی معقول تصور کی جا رہی تھی ماحولیاتی بحران اس طرز زندگی کو ناممکن البقا ثابت کر رہا ہے۔ یہ سرمایہ داری کے لیے ایک وجودی خطرہ ہے۔ ایک ایسا وجودی خطرہ جو سرمایہ دارانہ علمیت (سائنس) نے خود پیدا کیا ہے۔ یہ خطرہ ان معنوں میں بالکل نیا ہے کہ اپنی ایک ہزار سالہ تاریخ میں سرمایہ دارانہ نظام کو اس سے پہلے اس قسم کے بحران سے کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔

سرمایہ دارانہ طرز حیات اور نظم زندگی کی ترتیب نو کے مثالی خاکے (ideal types) وہ گروہ پیش کر رہے ہیں جن کو بحیثیت مجموعی ایکو اشتراکی کہا جاتا ہے۔ اس گروہ کی تجاویز اور ڈسکورس کا اثر کسی نہ کسی حد تک ہر ماحولیاتی اصلاحی پالیسی ساز مکتب فکر (لبرل، نیو کنزین،

نیولبرل، انارکسٹ، سوشل ڈیموکریٹ، کمیونسٹ وغیرہ) کی فکر میں پایا جاتا ہے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ سوشل ازم سرمایہ دارانہ عدل اجتماعی کی سب سے قدیم اور دیرپا جستجو ہے (یہ اور بات ہے کہ سرمایہ دارانہ عدل سوشلسٹ قالب میں کبھی ظاہر نہیں ہوتا)۔

میں اس مضمون میں ایسی ایکواشترا کی تجاویز کا جائزہ لینے کی کوشش کروں گا جو ماحولیاتی بحران سے نپٹنے کے لیے سرمایہ دارانہ طرز حیات میں اصلاح کاری کے لیے مرتب کی گئی ہیں۔ ان تجاویز کی تنفیذ کے امکانات پر غور کروں گا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کروں گا کہ اس نوعیت کی اصلاح کاری کے نتیجے میں سرمایہ دارانہ طرز حیات ماحولیاتی بحران سے نبرد آزمائی کا موثر ذریعہ نہیں بن سکتا۔

سرمایہ دارانہ نظم اور ماحولیاتی ابتری: ایکو سوشلسٹوں کی نظر میں

ایکواشترا کیوں کی نظر میں ماحولیاتی بحران کے پیداوار وہ نجی سرمایہ کار ہیں جو مستقل بڑھوتریٔ منافع کی جستجو میں لگے رہتے ہیں۔ بالخصوص وہ نجی سرمایہ کار جنہوں نے تیل، گیس کے استعمال کی بنیاد پر سرمایہ دارانہ پیداواری اور مواصلاتی نظام وضع کیا۔ سرمایہ دارانہ نظم زندگی کی ہر شکل (نجی، سرکاری، گروہی) کا نظاماتی ہدف آزادی کا حصول اور فروغ ہے اور حصولِ آزادی کا مطلب اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ انسانی ارادہ تمام کائناتی قوتوں (مادی اور غیر مادی) پر اپنا تسلط قائم کرتا چلا جائے۔ سرمایہ آزادی کے حصول کا لازمی وسیلہ ہے لہٰذا ہر سرمایہ دارانہ نظام (نجی، سرکاری، گروہی) بڑھوتریٔ سرمایہ کو بنیادی ہدف ارتقا کے طور پر قبول کرنے پر مجبور ہے۔ یہ آزادی کا جبر ہے۔

ایکواشترا کیوں کا یہ دعویٰ کہ آزادی کا یہ جبر صرف نجی سرمایہ دارانہ ممالک میں نافذ ہے بالکل خلاف واقعہ اور اصولاً غلط ہے۔ ہر سرکاری سرمایہ دار (سوویت یونین اور چین) اور گروہی (وینزویلا) ریاست نے آزادی کے اس جبر کو ہمیشہ قبول کیا ہے۔ اس لیے نہیں کہ وہ ایسا کرنے پر عالمی سرمایہ دارانہ مسابقت کے تقاضوں کی وجہ سے مجبور تھے اور اس لیے بھی نہیں کہ ان کے پالیسی سازوں سے کچھ غلطیاں سرزد ہو گئیں بلکہ اس لیے کہ سرکاری اور گروہی

سرمایہ دارانہ ممالک کی غالب انفرادیت سرمایہ دارانہ تھی اور بڑھوتریٔ سرمایہ (آزادی) کی اقداری تقدیم پر سیاسی نظم کے ذریعے اصرار کرتی ہے۔ نجی سرمایہ کارانہ ممالک کا اشتراکی سرمایہ کارانہ ریاستی ڈھانچہ اختیار کر لینے سے ان کی ماحولیاتی بحران کو جنم دینے کی صلاحیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

سرمایہ دارانہ نظام میں قدرت (نیچر) کو ایک ایسا مادی ذخیرہ تصور کیا جاتا ہے جو خود تخلیقی (self-productive) ہے اور جو سرمایہ دارانہ پیداواری کارروائی کے لیے ہر وقت موجود رہتا ہے۔ یہ تصور قدرت بھی نجی اور اشتراکی سرمایہ داری میں یکساں طور پر موجود ہے اور نجی نظم ملکیت کو اشتراکی نظم ملکیت میں تبدیل کرنے سے یہ تصورِ قدرت متاثر نہیں ہوتا۔ نجی اور اشتراکی سرمایہ دارانہ نظموں میں نیچر کا بے دریغ استحصال مستقلاً جاری رہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نجی اور اشتراکی (سرکاری اور گروہی) نظم ملکیت کا وجہ الوجود بھی بڑھوتریٔ سرمایہ / حصول آزادی ہے اور اس مقصد کے حصول کی جستجو اس بات کی متقاضی ہے کہ قدرتی وسائل (خام مال، توانائی اور انسانی محنت) کو کم سے کم قیمت پر حاصل کیا جائے اور اس استحصالی عمل کو جاری رکھنے کے لیے جو نقصانات قدرت پر مسلط کیے جاتے ہیں وہ سرمایہ کار (نجی یا اشتراکی) پر عائد نہ ہوں۔ بلا استثنائے تفریق نظم ملکیت، خواہ نجی خواہ اشتراکی، سرمایہ داری ماحولیاتی تباہی کو فروغ دینے اور ماحولیاتی فضلے کے پہاڑ کھڑے کرنے دینے پر مجبور ہے۔ آزادی کا یہ جبر سرمایہ دارانہ نظام کو خود اپنی قبر کھودنے پر مجبور کر رہا ہے۔ ایکو سوشلسٹ کہتے ہیں کہ سرمایہ کار طبقہ ماحولیاتی استحصال کا ذمہ دار ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نجی سرمایہ کار طبقہ سرمایہ دارانہ عمل کا بنیادی فیض یافتہ ہے۔ سرمایہ دارانہ ادارتی ڈھانچہ ان کو نیچر کے استحصال پر اکساتا بھی ہے اور اس استحصال کو جاری رکھنے کے مواقع بھی فراہم کرتا ہے۔ یہ ایک ہیئتی / ساختی تجزیہ ہے لیکن بین السطور جو خیال ظاہر کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ استحصالِ نیچر کے سب سے زیادہ ذمہ دار نجی سرمایہ کار ہوتے ہیں۔ لیکن اس کی کوئی وجہ نہیں کہ اشتراکی سرمایہ کار (ریاستی یا گروہی) سرمایہ دارانہ استحصالِ نیچر سے بالا

ہوں اور ماحولیاتی تصرف کے ضمن میں ان کا رویہ نجی سرمایہ کاروں سے مختلف ہو کیونکہ دونوں طبقے سرمایہ دارانہ علمیت (سائنس) اور روحانیت کے پیداوار ہیں۔ کیا نجی سرمایہ کاروں کے تحکمی غلبہ کا خاتمہ ماحولیاتی بحران کے خاتمہ کے لیے کافی ہو گا؟ اس طبقہ کو کیسے قوت سے محروم کیا جائے گا اور تحکم نظام میں ان کی جگہ کون لے گا؟ سرمایہ دارانہ نظام جبر کی نئی ادارتی صف بندی کیا ہو گی؟ اس قسم کے سوالات کا غیر مبہم جواب ایکو اشتراکی فراہم نہیں کرتے۔ لیکن ایکو اشتراکی تحریروں میں اس کے بارے میں کچھ اشارے ضرور ملتے ہیں۔ اشتراکی تجزیات میں سرمایہ دارانہ ماحولیاتی بحران کو سرمایہ دارانہ معاشی اور معاشرتی بحران کا ایک شاخسانہ تصور کیا جائے۔ اس تصور میں ماحولیاتی بحران معاشرتی بحران کا ایک سبب بھی ہے اور ایک نتیجہ بھی۔ لہٰذا ماحولیاتی بحران کے خلاف جاری جدوجہد کو معاشرتی، سیاسی اور معاشی جدوجہد سے مربوط ہونا چاہیے۔ ماحولیاتی استحصال (کائناتی وسائل کی لوٹ مار) کا گہرا تعلق سامراجی نظاماتی تحکم سے بھی ہے۔ ماحولیاتی بحران سے نمٹنا ہے تو اشتراکیوں کی نظر میں نجی سرمایہ دارانہ نظام کی ہمہ جہت بحران آمیزی سے نجات حاصل کرنا ہو گی۔ ماحولیاتی بحران کو سرمایہ دارانہ نجی بحرانوں سے الگ رہ کر رفع نہیں کیا جا سکتا۔ سرمایہ جس نیچر کے استحصال پر انحصار کرتا ہے اسے اپنی کارفرمائی سے تباہ کرتا رہتا ہے۔ دوسرے معنوں میں سرمایہ دارانہ نظام جس شاخ پر کھڑا ہے اسے ہی مسلسل کاٹ رہا ہے۔

ٹیکنولوجیکل ارتقا کے ہر دور میں ایسی نئی اشیا دریافت ہوتی رہتی ہیں جو سرمایہ کارانہ منافع خوری کو بلند سے بلند سطح پر پہنچانے کے لیے لازمی قرار دی جاتی ہیں۔ مثلاً اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں شکر، چاندی، بیسویں صدی میں پیٹرو کیمیکل اشیا اور کھاد اور دور حاضر میں لیدر، ریئر ارتھ مادے، جی ایم او بیج، ٹیکنالوجیکل ارتقائی عمل ان اشیا کے خزانوں کو تیزی سے خالی کرتا رہتا ہے اور یوں ماحولیاتی توازن میں بگاڑ پیدا ہوتا رہتا ہے اور معاشی عمل ماحولیاتی بحران کو مہمیز دینے کا سبب بنتا رہتا ہے۔ سرمایہ دارانہ ارتقائی عمل (نجی، ریاستی، گروہی) ماحولیاتی بحران کو ختم نہیں کرتا بلکہ اس کے منبع (سورس) کو تبدیل کرتا رہتا ہے۔ مثلاً تیل

کے ذخائر ختم ہونے کا خطرہ ہے تو ٹیکنالوجیکل ارتقائی عمل توانائی کی کسی اور منبع / سورس (ہوا، سورج کی شعاعیں وغیرہ) کو فروغ دیتا ہے۔ توقع یہ ہوتی ہے کہ اس نئی توانائی کے منبع (سورس) کے کائناتی ذخائر لامحدود ہیں اور ان کے استعمال کے ذریعہ لامحدود بڑھوتری سرمایہ کا عمل (جو کہ ہر نظم سرمایہ داری کا وجہ الوجود ہے) ابداً جاری رہ سکتا ہے۔ جب یہ مفروضہ غلط ثابت ہوتا ہے تو کسی نئے ذخیرہ کی تلاش ٹیکنالوجیکل ارتقائی عمل کا مقصد بن جاتا ہے۔ پرانی سے نئی ٹیکنالوجیز کی طرف انتقال ایک نہایت پر خطر اور مہنگا عمل ہے اور رفتارِ سرمایہ کاری کو مہمیز دینے کی جستجو میں ہر سرمایہ دارانہ نظام چاہے وہ نجی سرمایہ داری ہو یا ریاستی و گروہی سرمایہ داری ہو کا ہدف ہوتا ہے۔ سرمایہ کار نئی ٹیکنالوجیز کے فروغ و جستجو اور انکی طرف انتقال کی قیمت کو معاشرہ کے غیر سرمایہ کار طبقوں کی طرف منتقل کرنے کی مسلسل جستجو کرتے رہتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ ماحولیاتی استحصال کا یہ عمل عالمی پیمانہ پر جاری ہے۔ اقوام متحدہ کی آئی پی سی سی کمیشن کے سائنس دان موجودہ بائیو فزیکل کیمیکل دور کو اینتھروپوسین کہتے ہیں یعنی ایک ایسا دور جس میں کائناتی تاریخ میں پہلی مرتبہ انسانی عمل کائناتی توازن پر غالب آگیا ہے اور اس ماحولیاتی توازن کو تیزی سے برباد کر رہا ہے. کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اینتھروپوسین کے دور کا خاتمہ کب اور کیسے عمل میں آئے گا۔ اشتراکی سرمایہ دار یہ نہیں بتاسکتے کہ سرمایہ داری کی سبز کاری کی یہ مہم کس حد تک اور کب تک کامیاب ہوگی۔ لبرل اور اشتراکی سرمایہ دارانہ ملکوں میں سبز کاری کی مہم بنیادی طور پر ایک ٹیکنولوجیکل مسابقت کی جدوجہد کا رنگ اختیار کر گئی ہے یعنی ایک ایسی جدوجہد جس کے ذریعہ ختم ہوتے ہوئے توانائی کے ذخائر کی جگہ ایسی توانائی کے ذخائر دریافت کیے جارہے ہیں جن کو لامحدود فرض کیا جارہا ہے۔ اشتراکی سبز کار ٹیکنالوجیکل منہج کو تبدیل کرنے کی کوئی نئی تجویز پیش نہیں کرتے مثلاً چین کی سبز کاری کے تمام منصوبے امریکا اور دیگر سرمایہ دار ملکوں کی طرح اسی ٹیکنالوجیکل منہج کی بنیاد پر ہی مرتب کیے گئے ہیں۔

اشتراکی سبز کار سرمایہ دار ماحولیاتی بحران رفع کرنے کے لیے مندرجہ ذیل اقدام پر زور دیتے ہیں:

۱۔ قبائلیوں اور قدیم ساکنان (indigenous people) کی زمینوں پر کارپوریشنوں کے قبضہ کو ختم کیا جائے اور قبائلی اور قدیمی باشندوں کے سرمایہ دارانہ حقوق کو تسلیم کر کے ان کی سیاسی قوت میں اضافہ کیا جائے۔

۲۔ سامراجی استحصالی نظام کا خاتمہ

۳۔ عورتوں کی خاندانی ذمہ داریوں اور بوجھ کا خاتمہ

۴۔ عورتوں میں سرمایہ دارانہ ملازمتوں کا فروغ

۵۔ عورتوں کے سرمایہ دارانہ سماجی حقوق کی ریاستی فراہمی

۶۔ نسلی امتیازات کا خاتمہ

یعنی اشتراکی سبز کاروں کا مقصد ایسی تحریکات منظم کرنا ہے جو ماحولیاتی کثافت کے خاتمہ کی جدوجہد کو سماجی اور معاشی ناانصافیوں کے ساتھ منسلک کرتی ہیں اور سرمایہ دارانہ عدل کو فروغ دینے کی کوشش کرتی ہیں۔ ان میں سے کوئی پالیسی اور تحریک بھی سرمایہ کاری کے وجہ الوجود کے انہدام کی تجویز نہیں ہیں بلکہ ان سب اہداف کو سرمایہ داری کے بنیادی ہدف بڑھوتری برائے بڑھوتری سے ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات تراجع نمو یعنی ڈی گروتھ تحریک کے بارے میں بھی درست ہے کیونکہ وہ بھی رفتار بڑھوتریٔ سرمایہ کی تحدید کو بالآخر سطح زندگی میں اضافہ کا ذریعہ گردانتی ہے۔ ڈی گروتھ نظریہ انسانی ضرورتوں کو سرمایہ کی بڑھوتری کی جگہ سرمایہ دارانہ عمل کا محرک گردانتا ہے اور اس بات سے سہو نظر کرتا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں انسانی ضرورتوں کی بڑھوتری کی کوئی حد نہیں ہو سکتی اور انسانی ضرورتوں کی بڑھوتری بالآخر بڑھوتریٔ سرمایہ کا محرک بنتی چلی جاتی ہے۔ آزادی / سرمایہ انسانی ضرورتوں کی لامتناہی بڑھوتری کے بغیر نہیں بڑھ سکتے۔

آزادی کو مقصد حیات کے طور پر تسلیم کرنے والی انفرادیت سرمایہ دارانہ انفرادیت ہے جو

سرمایہ دارانہ معاشرت کی غالب انفرادیت ہے اور اس کا اظہار جمہوری عمل سے ہوتا ہے۔ جمہوری عمل کے ذریعے سرمایہ کا بندہ اپنی ربوبیت کا دعویٰ کرتا ہے یعنی اس دعویٰ کا اظہار کہ عبدِ سرمایہ کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے ارادے کے تحت تخلیق حیات اور کائنات کا عمل جاری رکھے۔ تخلیق کائنات و حیات کا عمل جاری رکھنا عبدِ سرمایہ کی بنیادی ضرورت ہے اور اس بنیادی ضرورت کی ترویج کے لیے اس کی ذیلی ضرورتوں کی لامتناہی بڑھوتری لازمی ہے۔ لہٰذا ہر جمہوری معاشرت (سول سوسائٹی) اپنے اندر پائی جانے والی ضرورتوں کی ترتیب کو ان کی مجموعی بڑھوتری سے ہم آہنگ کرتے رہنے پر مجبور ہے۔ یہی ترقی ہے اور ترقی کا مطلب ہی خواہشات نفسانی کی لامتناہی بڑھوتری کا مستقل جاری رہنا ہے۔

اشتراکی سرمایہ کار لبرل اور قوم پرست سبز کار سرمایہ کاروں کی طرح آزادی اور ربوبیت انسان کو بحیثیت نظاماتی اہداف قبول کرتے ہیں۔ لہٰذا دونوں میں سے کسی کے لیے بھی ممکن نہیں کہ وہ سرمایہ / ضرورتوں کی لامتناہی بڑھوتری کو بحیثیت معاشرتی ہدف رد کر دے۔ بڑھتے ہوئے ماحولیاتی بحران کے تناظر میں دونوں نظریات ضرورتوں کی ترتیب نو اس بڑھتے ہوئے عمومی رجحان سے ہم آہنگ کرنے کی جستجو کرتے رہتے ہیں۔ یہ ماحولیاتی بحران کو موخر کرنے کا طریقہ ہے اس کو ختم کرنے کا طریقہ نہیں۔

ماحولیاتی بحران سے مستقل طور پر نجات پانے کے لیے ضروری ہے کہ سرمایہ دارانہ انفرادیت کا معاشرتی غلبہ منہدم ہو یعنی معاشرہ میں غلبہ ایسے افراد کا ہو جو قولاً اور عملاً اس باطل دعویٰ کو رد کریں کہ انسان خالق کائنات اور آزاد ہے اور ایسا معاشرہ اور ریاست بنائیں جس میں ضرورتوں کی مستقل بڑھوتری انفرادی اور انسانی عمل کا ہدف نہ ہوں۔ اسلامی تاریخ میں سامراجی تغلب سے پہلے ایسی ریاستیں اور معاشرے بارہ سو سال تک کارفرما رہے۔ ہم اسلامی انقلابی ہیں اور اسی سنہرے دور کے احیاء کی جدوجہد کر رہے ہیں۔

وہی دیرینہ بیماری وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

سبز سرمایہ داری کا سراب

صابر علی

اکیسویں صدی میں سرمایہ داری کو ماحولیاتی بحران کا سامنا ہے جو پچھلے تمام بحرانوں سے زیادہ پیچیدہ ہے۔ ارضی حرارت غیر متوقع طور پر شدید ہوتی جارہی ہے اور حکومتوں سے لے کر ملٹی نیشنل کارپوریشنوں تک سرمایہ دارانہ قیادت اس کوشش میں ہے کہ سرمایہ دارانہ طریقوں کو ماحولیاتی تبدیلیاں کنٹرول کرنے اور اس کی شدتیں کم کرنے کے لیے استعمال کیا جائے۔ سبز سرمایہ داری میں مارکیٹ کے ذریعے ماحولیاتی تبدیلیوں کو تجارتی اشیا میں بدل کر سسٹم کے اندر لانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ کاربن مارکیٹ، آفسٹ سکیم، گرین بانڈز اور حالیہ carbon inset کے طریقوں نے ماحولیاتی تبدیلی کو فنانشل ٹریڈنگ اور سٹہ باز منافع میں بدل دیا ہے۔ یہ فنانشل اختراعات ایسے حل کے طور پر پیش کی جارہی ہیں جن کا بظاہر کوئی نقصان نہیں ہوگا اور ماحولیاتی بقا کو سرمایہ کی بڑھوتری سے ہم آہنگ کیا جاسکے گا۔

یہ کموڈیفی کیشن محض معاشی اختراع نہیں بلکہ یہ فطری دنیا کے ساتھ انسانی تعامل کا ایک وسیع تر عملیاتی اور اخلاقی نقطۂ نظر بھی ہے۔ ماحولیاتی باقاعدگی کو قابل تجارت اثاثہ بنا کر سبز سرمایہ داری ان اخلاقی پیچیدگیوں اور وجودی ذمہ داریوں سے نظر ہٹا دیتی ہے جو ماحولیاتی بحران کے اصل حل کی طرف لے جاسکتے ہیں۔ اس حوالے سے اسلام کا نقطۂ نظر سرمایہ دارانہ نقطۂ نظر سے بالکل مختلف ہے۔ اسلام فطرت پر تحکم اور غلبہ کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ انسان کو فطرت کا امین بناتا ہے۔ انسان کو زمین کی خلافت عطا کی گئی ہے جس سے انسان پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ایک توازن قائم رکھے اور تمام مخلوقات سے شریعت کے احکام اور طریقت کی آدرشوں کے مطابق استفادہ کرے۔ جدیدیت کی تخفیفی (reductionist) منطق میں روحانی اور اخلاقی جہات کو منافع کی عقلیت کے تحت تصور کیا جاتا ہے۔ اس غالب، منتشر اور مضر عقلیت کا حقیقی متبادل اسلامی تصورِ حیات سے ہی دیا جاسکتا ہے۔ سب سے پہلے ہمیں یہ

دیکھنا چاہیے کہ سبز سرمایہ داری کے فریم ورک میں کس طرح ماحول اور فضا کو ایک تجارتی شے اور اثاثہ بنایا جاتا ہے۔

سبز سرمایہ داری میں ماحولیاتی کموڈیفی کیشن

ماحولیاتی کموڈیفی کیشن سے مراد وہ عمل ہے جس کے ذریعے فطری ماحول کے مختلف عناصر بالخصوص ماحولیاتی ابتری اور فضائی آلودگی میں تخفیف سے متعلقہ عوامل کو ایسی اشیا میں بدلا جاتا ہے جنہیں فنانشل مارکیٹوں میں بیچا اور خریدا جا سکتا ہے۔ سبز سرمایہ داری میں کئی نئے فنانشل آلات وضع کیے گئے ہیں۔ کاربن مارکیٹ اور آفسٹ اس کی نمایاں ترین مثال ہے۔ کاربن ٹریڈنگ اسکیم کمپنیوں کو کاربن کریڈٹ خریدنے کے قابل بناتی ہے۔ ان کریڈٹس کو ماحولیاتی معیارات یا کارپوریٹ اہداف حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ گرین بانڈز اور کلائمیٹ فنانس میں حکومتیں اور کارپوریشنیں ایسے بانڈ جاری کرتی ہیں جو ماحولیاتی پراجیکٹس کے ساتھ مخصوص ہوتے ہیں مثلاً قابل تجدید توانائی سے متعلق پراجیکٹ۔ ان بانڈز کو ماحولیاتی بقا میں اہم سمجھا جاتا ہے اور یوں ماحولیاتی فوائد کو مونیٹائز کیا جاتا ہے۔ کاربن insets حالیہ ماڈل ہیں جن میں کسی کارپوریشن کی سپلائی چین کا فضلاتی اخراج کم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اگرچہ تکنیکی طور پر یہ offset سے مختلف ہیں لیکن بنیادی اصول ان میں بھی یہی ہے کہ فضلاتی اخراج کو مقداری اور مارکیٹی بنایا جاتا ہے۔

ان تمام طریقوں میں ارضی تحفظ کی اخلاقی اور اجتماعی ذمہ داری کو اقتصادی شے کی صورت میں سمجھا جاتا ہے۔ کبھی فطرت کو ایک مقدس امانت یا مشترک ورثہ خیال جاتا تھا لیکن اب یہ لاگت و منافع تجزیات میں محض ایک متغیر بنا دیا جاتا ہے جن کا مقصد مالی نفع حاصل کرنا ہوتا ہے۔ مارکیٹ منطق پیچیدہ ماحولی عوامل کو اعداد اور سرٹیفکیٹس میں بدل کر فطرت کی بدیہی قدر نظروں سے اوجھل کر دیتی ہے۔

سبز سرمایہ داری کا تصور ماحولیاتی بحران اور اقتصادی عالمگیریت کے جڑواں دباؤ کا نتیجہ ہے۔ اس کے حامیوں کا موقف ہے کہ اقتصادی بڑھوتری کے سرمایہ دارانہ محرکات کا رخ بدل کر

ماحولیاتی بحران پر قابو پایا جا سکتا ہے اور نجی سرمایہ کاروں کی منافع کی ہوس کو مفادِ عامہ کے ساتھ مربوط کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ جو کمپنیاں قابل تجدید توانائی میں سرمایہ کاری کرتی ہیں یا محفوظ طریقے اختیار کرتی ہیں وہ دوسری کمپنیوں پر حاوی ہو سکتی ہیں اور اس طرح ایجادات اور سرمایہ کاری کا خوش گوار چکر پیدا ہو گا۔

تاہم ناقدین کا موقف ہے کہ اگرچہ سبز سرمایہ داری ٹیکنالوجیکل پیش رفتوں کو بڑھاوا دے کر جزوی بہتری لا سکتی ہے مگر ماحولیاتی ابتری کی اصل وجوہات دیکھنے میں ناکام ہے۔ فطرت کو کموڈٹی کے طور پر تخلیق کرنے سے ماحول کے متعلق آلاتی نقطہ نظر کو تقویت ملتی ہے جس میں قدرتی وسائل بس اسی حد تک اہم ہوتے ہیں جہاں تک یہ اقتصادی بڑھوتری میں کوئی کردار ادا کرتے ہیں۔ اس طرح عین وہی مضر طرز عمل پروان چڑھتا ہے جو پہلے ہی ماحولیاتی بحران کا باعث بنا ہے۔

اقتصادی اور سیاسی نتائج

کلائمیٹ کموڈیفی کیشن کے گہرے اقتصادی اور سیاسی نتائج ہیں۔ فنانشل مارکیٹیں، ریگولیٹری ایجنسیاں اور کارپوریشنیں اب ایسے فریم ورک میں چل رہی ہیں جس میں ماحولیاتی کارکردگی کو معاشی لحاظ سے پرکھا جاتا ہے۔ کاربن قیمتیں اور مارکیٹ پر استوار پالیسیاں نافذ کرنے کا فائدہ تبھی ہو گا جب فضلاتی اخراج میں تخفیف ہو۔ لیکن سرمایہ دارانہ منافع خوری کے بنیادی محرک کی موجودگی میں ایسا ناممکن ہے۔ مزید برآں، قدرتی عوامل کو فنانشل مصنوعات میں تبدیل کرنے سے نامساویت کو بڑھاوا ملتا ہے۔ دولت مند قومیں اور کارپوریشنیں گرین ٹیکنالوجی میں سرمایہ کاری کر کے منافع کما سکتی ہیں جبکہ غریب ممالک ماحولیاتی ابتری کا مزا چکھنے کے لیے بے یارومددگار چھوڑ دیے جائیں گے۔ فوائد اور نقصانات کی یہ نامساویانہ تقسیم گہرے اخلاقی سوالات اٹھاتی ہے جو صرف غیر سرمایہ دارانہ فریم ورک سے ہی اٹھائے جا سکتے ہیں۔

اسلامی اصول اور ماحولیاتی نگہبانی

اسلامی اخلاق فطری دنیا کی تفہیم اور تعامل کے لیے ایک ممتاز نقطہ نظر فراہم کرتے ہیں۔ اسلام میں انسان زمین کا مطلق العنان اور خود مختار مالک نہیں بلکہ خلیفہ / امین یا ٹرسٹی ہے جسے اللہ کی بعض مخلوقات پر محدود تصرف اس کی آزمائش اور امتحان کی غرض سے امانتاً دی گئی ہیں۔ امین ہونے کی حیثیت سے انسان ان امانتوں سے بقدر ضرورت استفادہ کر سکتا ہے۔ یہ بہت بڑی اخلاقی ذمہ داری ہے؛ انسان کی ذمہ داری ہے کہ وہ فطری دنیا کو الوہی ہدایت اور رہنمائی کے مطابق قائم رکھے اور اس کا تحفظ کرے۔ نگہبانی ماڈل میں ہر ایسے تصور کو مسترد کیا جاتا ہے جو فطرت کی تسخیر اور استحصال کا دعویٰ کرتا ہو۔ تصورِ توحید کے مطابق تمام تخلیق الوہی نظم میں باہم مربوط اور وحدت کی حامل ہے۔ فطرت اللہ کی تخلیقی صفات کا اظہار ہے اور فطری دنیا کا ہر عنصر ایک بدیہی قدر رکھتا ہے۔ اس طرح فطرت کو محض انسانی تصرف اور منافع کے طور پر دیکھنا ممکن نہیں۔ فطری دنیا میں میزان اور توازن قائم رکھنا اسلامی تعلیمات کا اہم اصول ہے۔ اللہ نے اس کائنات کو توازن اور ٹھیک اندازے پر تخلیق کیا ہے اس لیے انسانی اعمال اس اندازے اور توازن کو قائم رکھنے والے ہوں، نہ کہ اسے بگاڑنے والے۔ سیکولر اور جدیدی نظریات میں فطری وسائل کا استحصال اس بنیاد پر روا رکھا جاتا ہے کہ انسان فطرت کا حاکم اور مالک ہے لیکن اسلام میں حقیقی ملکیت اللہ تعالیٰ کی ہے۔ انسان عارضی امین و متصرف ہیں اس لیے فطری نظم میں خرابی پیدا کرنے والا ہر عمل ممنوع ہے۔

جدیدیت اور جدید تعقل

جدید اقتصادی نظام نے مارکیٹ کو فقید المثال غلبہ دیتے ہوئے انسانی وجود کے ہر پہلو کو کموڈٹی بنا دیا ہے۔ اس نظام نے انسانی زندگی کے اخلاقی پہلو کو غیر اہم بنا کر زندگی کو بے مقصد اور بے معنی بنا دیا ہے۔ جدیدیت کی آلاتی عقلیت محدود اور تنگ نقطۂ نظر ہے جس میں اخلاقی توجیہات سے منقطع ہو کر انجام کے بجائے محض ذرائع پر توجہ دی جاتی ہے۔ اسی اخلاقی

فقدان کی بدولت نابودیت، استحصال اور تنازعات جیسے مسائل پیدا ہوئے ہیں۔ اسی عقلیت کا شاخسانہ ہے کہ کلائمیٹ کموڈیفی کیشن کی صورت میں تکنیکی حساب کتاب غالب آ گیا ہے۔ آلاتی عقلیت سبز سرمایہ داری کے نام پر غلبے اور تسخیر کا دائرہ اس فضا تک وسیع کر رہی ہے جس میں ہم سانس لیتے ہیں۔

جدیدیت کا سیکولر نقطۂ نظر ایسی غیر تقدیسی وجودیات کا حامل ہے جو انسانی نشوونما کے لیے لازمی معانی و مقصد کی افادیت مسترد کرتی ہے۔ قرآنی نقطہ نظر سے یہ فطری دنیا آیات یعنی نشانیاں ہیں جو الوہی حقیقت کی طرف اشارے ہیں۔ پہاڑ، دریا، جنگلات اور فضا محض سفاک اور جامد مادہ نہیں بلکہ زندہ وجود ہیں جو خالق کی تسبیح میں ہر لحظہ مصروف ہیں اگرچہ انسان ان کی تسبیحات نہیں سمجھ سکتے۔ کلائمیٹ کموڈیفی کیشن ان زندہ وجودوں کو مادی کاربن کریڈٹس میں بدل کر ایک علمیاتی اور مابعد الطبیعاتی تشدد کرتی ہے جس میں مخلوق کو اس کی بدیہی شان اور مقدس مقصد سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

سیکولر علمیت سائنس اور مذہب کی بے سروپا ثنویت قائم کر کے دونوں اقالیم مسخ کر دیتی ہے۔ اس علمیت میں محض اعداد و شمار اور پیمائش کو اہمیت دی جاتی ہے اور جو چیز اعداد و شمار میں نہ آ سکے اسے غیر اہم بنا دیا جاتا ہے۔ اس تنگ نقطۂ نظر کے بدولت محض وقتی حل ہی سوجھتے ہیں جن میں علامات ختم کرنے پر دھیان دیا جاتا ہے اور مرض کے اصل اسباب جوں کے توں موجود رہتے ہیں۔ کلائمیٹ کموڈیفی کیشن اسی لیے ممکن ہوئی کہ سیکولر نظریات مذہبی علم کی دنیاوی علم سے عدم مطابقت فرض کرتے ہیں۔ اخلاقی جائزوں سے محروم علمیت انسانیت کے لیے جو حل پیش کر رہی ہے درحقیقت وہی حل بحرانوں کے اسباب ہیں۔ انہیں حل کے طور پر قبول کرنے سے بحران مزید بدتر اور پیچیدہ ہو گا۔

یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ سبز سرمایہ داری بھی اخلاقی پہلوؤں پر زور دیتی ہے اور ماحولیاتی عدل اس کا اہم تصور ہے۔ لیکن سرمایہ دارانہ اخلاقی تصورات مذہبی اخلاقی تصورات سے بالکل مختلف ہیں۔ مذہب اخلاق کے ماتحت نہیں بلکہ اخلاق مذہب کے ماتحت ہیں۔ حقیقی

اخلاقی حل یہ ہے کہ فضا، ماحول اور فطری دنیا سے تعامل اور تعلق میں اللہ کے احکام کی پیروی کی جائے۔ اسلامی کونیات میں غیب کا تصور مادیت پسندانہ مفروضات کو چیلنج کرتا ہے۔ کاربن مارکیٹ محض ظاہری اور مقداری سطح پر کارفرما ہے جس میں حقیقت کے غیر مرئی پہلوؤں کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ ماحول سے تعلق میں یہ دیکھا جائے گا کہ انسانی اعمال کے روحانی اثرات کیا کیا ہو سکتے ہیں۔

ٹیکنالوجی کا سراب

جدیدیت کی علمیت میں بے اعتدالی سے تکنیکی آلاتیت پر زور دیتے ہوئے سائنس، ٹیکنالوجی اور ترقی کے ذریعے فطرت پر حاکمیت اور اس کی تسخیر کی جستجو کی جاتی ہے۔ سبز سرمایہ داری اسی رجحان کی نمایندہ ہے جس میں ماحولیاتی بحران کے اخلاقی و روحانی اسباب نظر انداز کرتے ہوئے تکنیکی اور مارکیٹی حل پیش کیے جا رہے ہیں۔ تکنیکی حل سے انسان کے استحصالی رویے میں کوئی کمی نہیں آتی۔ یہ محض ایک سراب ہے کہ ٹیکنالوجی کے ذریعے ماحولیاتی بحران کا حل نکالا جا سکتا ہے۔ جب تک انسان حرص و ہوائے نفس نہیں چھوڑتا تب تک اس کا ہر عمل ظاہری اور پوشیدہ مضر نتائج پر منتج ہوتا رہے گا۔ سبز سرمایہ داری کا یہ مفروضہ سفید جھوٹ ہے کہ صارفیت اور اقتصادی ساختوں کی موجودہ ترتیب قائم رکھتے ہوئے کسی نئی ٹیکنالوجی سے مستقبل محفوظ بنایا جا سکتا ہے۔

ماحولیاتی گورنینس کے اخلاقی اصول

اسلامی تعلیمات کا اہم اور بنیادی اصول جلب منفعت اور دفع مضرت ہے۔ فوائد و نقصان کے معیارات عقل کی بنیاد پر نہیں بلکہ وحیٔ الٰہی کی بنیاد پر طے ہوتے ہیں۔ کوئی بھی لائحہ عمل طے کرتے وقت یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس کے خود اپنے اور دوسروں کے لیے کیا کیا فوائد و نقصانات ہو سکتے ہیں۔ یہ سوچ بچار فوری اور طویل المدت دورانیے کے لیے ہوتا ہے۔ ہر وہ عمل مشکوک ٹھہرے گا جس میں فوری فوائد تو ہوں لیکن طویل مدت میں ان کے برے اثرات

مرتب ہو سکتے ہوں۔ اس لیے ٹیکنالوجی کو اخلاق کی اقلیم میں لایا جائے اور وحی کی رہنمائی میں انسانی عقل استعمال کرتے ہوئے انسانی منفعت یقینی بنائی جائے۔ کلائمیٹ گورننس میں اقتصادیات اور ٹیکنالوجی کو وحی سے ماخوذ اخلاق کے تابع کیا جائے۔ اہم سوال یہ نہیں کہ ہم ماحولیاتی تحفظ کو منافع بخش کیسے بنا سکتے ہیں بلکہ اہم سوال یہ ہے کہ ارضی امانت کی ذمہ داری میں ہم سے کیا کیا کوتاہیاں ہوئیں اور ہم اس ذمہ داری کو کیسے نبھا سکتے ہیں۔ ماحولیاتی تحفظ کی پالیسیوں میں اقتصادی کارکردگی کی بجائے اخلاقی معیارات ملحوظ رکھے جائیں۔

فضا کو محض کاربن سِنک نہ سمجھا جائے بلکہ الوہی تخلیق کے طور پر دیکھا جائے۔ انسان فطرت کا حصہ ہیں، اس سے جدا یا اس پر حاکم نہیں۔ انسانی بہتری سارے تخلیقی نظم کی بہتری سے جدا نہیں کی جا سکتی۔ ہمیں شریعت کے مقاصد سے رہنمائی لیتے ہوئے عملی اقدامات کرنے چاہئیں۔ موجودہ ارضی بحران درحقیقت ایک روحانی بحران کا نتیجہ ہے کہ انسان امین کے بجائے تخلیق کا مالک بن بیٹھا ہے۔ اعتدال، قناعت اور شکر ایسے تریاق ہیں جو ماحولیاتی بحران کو جنم دینے والی مریضانہ صارفیت کا علاج کر سکتے ہیں۔ ہمارا طرز حیات مارکیٹی تقاضوں کے بجائے شرعی احکام و نبوی طرز زندگی سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ حقیقی بقا اور استحکام داخلی تبدیلی اور انقلاب سے آتا ہے، محض خارجی تنفیذات اور انتظامات وقتی دلاسے ہیں۔ اقتصادی پالیسیوں میں کارکردگی (efficiency) کے بجائے کفایت (sufficiency) کا اصول اختیار کیا جائے۔ بڑھوتری کے بجائے میزان اور توازن اختیار کیا جائے۔ سبز سرمایہ داری کے سبز اور صاف پروڈکشن کے دعوے کی بجائے صارفیت کی حوصلہ شکنی کی جائے۔

معیشت، معاشرت و سیاست

قرض کی معیشت کیا ہے؟

سید محمد یونس قادری

قرض کیا ہے؟ قرض ایک وعدہ ہے ایک رقم کو آج لے کر اس کو کچھ عرصہ بعد واپس کرنے کا۔ جدید دور میں قرض ایک شے ہے جس کی قدر سود کے ذریعہ متعین کی جاتی ہے۔ یعنی آج جو رقم قرض پر دی گئی ہے اس کی مالیت کچھ عرصہ بعد کیا ہوگی؟ وہ عوامل جو سود پر اثر انداز ہوں گے وہ گرانی کی شرح یا انفلیشن اور شرح سود ہیں۔

فرض کریں بکر نے زید کو ایک ماہ کی مدت کے لیے ۱۰۰۰ روپے قرض دیے۔ اگر زید اور بکر کا تعلق دو اجنبیوں کا ہے تو بکر کا فوری رد عمل ہوگا کہ اس قرض دینے سے مجھے کیا فائدہ ملے گا۔ اگر فرض کریں اس ۱۰۰۰ روپے سے بکر ۱۰ کلو آٹا آج خرید سکتا ہے مگر ایک ماہ بعد آٹے کے دام بڑھنے کی توقع ہے جو کہ ۱۱۰ روپے کلو ہو جانے کے امکانات ہیں۔ جس سے اگلے ماہ ۱۰ کلو آٹا ۱۱۰۰ روپے میں آئے گا۔ یعنی ۱۰۰۰ روپے کی مالیت ۱۰ فیصد کم ہو گئی۔ اگر بکر ایک دنیا دار شخص ہے تو وہ زید سے مطالبہ کرے گا کہ تمہیں مجھ کو اگلے ماہ کم از کم ۱۱۰۰ روپے تو ادا کرنے ہی ہوں گے۔ اب اگر اس کو اس رقم پر منافع بھی کمانا ہو تو وہ اس قرض کو ۱۰ فیصد سے زائد شرح پر وصول کرے گا۔ ۱۰ فیصد تو اس کی واجبی یا نومینل شرح سود ہوگی مگر اس شرح پر حقیقی شرح سود صفر ہوگی[1]۔

گرانی کی شرح زر کی قدر کا ایک معیار ہو گیا کہ کم از کم اس شرح تک قرض کی لین دین ہوگی۔ اس کے علاوہ دیگر معیارات بھی ہیں۔ یہ ۱۰۰۰ روپے تو زر ہے جو کہ آلۂ تبادلہ ہے مگر جب اس کا تبادلہ زر کے ساتھ ہو تو پھر یہ آلۂ تبادلہ ہو گا یا قرض ہو جائے گا؟ اگر ۱۰۰۰ روپے میں ۱۰ کلو آٹا خریدا گیا تو ۱۰۰۰ روپے بحثیت آلہ تبادلہ استعمال ہوئے۔ ۱۰۰۰ روپے، ۱۰۰۰

---

[1] حقیقی شرح سود برابر ہے واجبی شرح سود جمع گرانی کی شرح۔ r=n+i جس میں r سے مراد حقیقی شرح سود، n سے مراد نومینل شرح سود اور i سے مراد انفلیشن یا گرانی کی شرح ہے۔

روپے ہی رہے گا چاہے آٹے کی قیمت کم یا زیادہ ہو جائے۔ آٹا کی مقدار بحیثیت شے کے کم یا زیادہ ہو گی۔ مگر ۱۰۰۰ روپے تو ویسے ہی رہیں گے۔ قرض کی صورت میں ادھار بن گئے مگر زر ہی رہے۔ اب زید اس کو اپنے پاس اندراج کرلے گا کہ اس کے پاس ۱۰۰۰ روپے اصل صورت میں آئے۔

۱۰۰۰ روپے بطور قرض جب زید کو دیے گئے تو اس سے زید کی ۱۰ کلو آٹے کی ضرورت کو پورا کیا گیا۔ اب اگر ۱۰ کلو زید کے استعمال کے لیے نہیں بلکہ اس کے کاروبار کے لیے دیے جائیں تو وہ اگر اس سے ۱۰ کلو آٹے کو ۱۱۰ روپے کلو کے حساب سے بیچتا ہے تو ایک ماہ بعد اس ۱۰۰۰ روپے سے آٹے کو بیچ کر ۱۱۰۰ روپے کما سکتا ہے۔ اب اگر بکر مطالبہ کرے کہ جو ۱۰۰ روپے منافع ہوا ہے اس میں بکر کا پیسہ اور زید کی محنت لگی ہے۔ تو اب دونوں کاروبار میں شریک ہوئے تو وہ منافع کو کسی بھی شرح سے تقسیم کر لیتے ہیں کہ فرض کریں ۵۰ فیصد کی شرح سے زید اور بکر منافع میں شریک ہوئے یہ متوقع منافع ہوا۔ نقصان کی صورت میں بکر کو ایک ماہ بعد ۱۰۰۰ روپے سے کم ملیں گے اور زید کو اس کی محنت کے عوض منافع نہیں ملے گا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرض کیا ہے؟ آیا یہ شے ہے یا زر؟ شے تو آٹا ہے جس کو بنانے میں محنت، مشین اور پیسہ درکار ہوتا ہے جس کو پیدا کرنے میں وقت بھی درکار ہوتا ہے۔ اگر زر کو شے بنا دیا جائے تو اس کو بنانے میں نہ تو بہت زیادہ محنت، نہ ہی مشین اور نہ ہی وقت درکار ہو گا۔ ۱۰۰۰ روپے کو بکر گھنٹوں، دنوں، مہینوں، سالوں کے حساب سے بیچ سکتا ہے۔ بکر نے ۱۰ فیصد کے حساب سے زید کو ایک ماہ کے لیے ۱۰۰۰ روپے دیے۔ زید نے ۵ فیصد دن کے حساب سے قمر کو دیے۔ قمر نے سمیر کو ۲ فیصد گھنٹوں کے حساب سے ۱۰۰۰ روپے دیے اور سمیر رات بھر کے لیے کسی اور کو یہی رقم دے سکتا ہے۔

اب آٹے کی ضرورت کو پورا کرنے اور کاروبار کے لیے زر کی ضرورت کم اہمیت کی حامل ہو جائے گی کیوں کہ زر سے زر کے تبادلہ میں محنت، خطرہ اور وقت بہت کم درکار ہوتا ہے۔ زر سے زر کا یہ تبادلہ اشیا کی مارکیٹ میں نہیں ہو سکے گا بلکہ اس کے لیے ایک اور مارکیٹ معرض

وجود میں لائی جائے گی جس کو زر کی مارکیٹ کہتے ہیں۔ جہاں زر قرض کی صورت میں خریدا اور بیچا جائے گا۔ مگر اس کی قدر و قیمت کیا ہو گی اور کیسے متعین ہو گی؟ جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ زر کی قدر میں اہم آلہ حقیقی شرح سود ہے۔ اس کے علاوہ جس مارکیٹ میں اس کو سب سے محفوظ سمجھا جائے گا وہ اس کی معیاری قیمت ہو گی۔ جس کو ہم اس مضمون میں آگے جا کر سمجھیں گے۔

زر کی ضرورت جو کسی ضرورت مند کو تھی تا کہ وہ اپنی صرف کی ضرورت کو پورا کر سکے وہ اس کو زر کے بازار سے سود کے عوض میسر آئے گا۔ اشیا کے بازار کو سرمایہ کاری / انویسٹمنٹ کے لیے جس زر کی ضرورت ہو گی وہ اس سے کافی حد تک محروم ہو جائے گا اور اگر حاصل ہو گا تو مہنگی شرحِ سود پر حاصل ہو گا۔ اس لیے اشیا کے بازار کو بھی فوری منافع کے حصول کے لیے زر اور سرمائے کے بازار کا رخ کرنا پڑتا ہے۔

سرمایہ کاری کے لیے زید کو جو رقم درکار ہو گی وہ اس کو زر کے بازار سے مہنگے داموں پر یعنی مہنگی شرحِ سود پر ملے گی۔ زید بکر کے بجائے بکر بینک لمیٹڈ سے قرض حاصل کرے گا۔ اور یہ شراکت نہیں بلکہ قرضہ ہو گا جس کی شرح بینک زیادہ متعین کرے گا چوں کہ کاروبار ایک پر خطر عمل ہے۔ اور اگر قرضہ زیادہ مدت کے لیے ہوا تو اس کی شرح سود میعاد اور خطرے کے بڑھنے کے ساتھ بڑھتی جائے گی۔ اس کاروبار کو خطرہ سے پاک کرنے کے لیے انشورنس کمپنی سامنے آتی ہے۔ یہ انشورنس بھی زر کے بازار میں بیچی جاتی ہے۔ جس کا ہر ماہ جبری پریمیم وصول کیا جاتا ہے۔ اور کاروبار میں حادثہ کی صورت میں ڈوبی ہوئی رقم واپس کرنے کا وعدہ کر کے اس کے اخراجات میں پریمیم کی رقم شامل کر دی جاتی ہے۔ حادثات کے امکانات جتنے زیادہ ہوں گے پریمیم کی رقم اتنی زیادہ ہو گی ورنہ کم ہو گی۔ اگر کوئی کاروبار چاہے کہ خطرہ خود مول لے تو اس کو قرضہ نہیں ملے گا۔ قرضہ خریدنے کے لیے سود اور پریمیم کا خرچہ ساتھ میں کرنا ہو گا جس سے قیمتوں میں اضافہ ناگزیر ہو گا۔ اب زید چاہے کہ میں زر کے بازار سے قرضہ نہ لوں تو اس کو اپنی کارپوریشن بنانی ہو گی جس کے لیے ایک اور مارکیٹ

معرض وجود میں لائی جاتی ہے اس کو حصص کی مارکیٹ یا اسٹاک مارکیٹ یا سرمائے کی مارکیٹ کہتے ہیں۔ جس میں زید اپنی کمپنی زید لمیٹڈ قائم کرتا ہے۔ زید اپنی کمپنی کی ملکیت کو فروخت کرتا ہے۔ اور اس کمپنی کے ۱۰۰ روپے کے حصص جاری کرتا ہے۔ جو یہ حصص خریدے گا وہ نہ صرف اس کمپنی کے منافع کا حصہ دار ہو گا بلکہ وہ اس کا ایک ایسا مالک ہو گا جس کا کوئی تعلق کمپنی کے معاملات سے نہیں ہو گا۔ بلکہ اس کمپنی کے معاملات کو چلانے کے لیے ایک مینجر متعین کرنا ہو گا جس کا کام اس کمپنی کے منافع کو بڑھانا ہو گا۔ بکر زید کی کمپنی کے حصص خرید کر اس کے کاربار میں شریک ہو جاتا ہے۔ مگر اس کو تو مارکیٹ سے کم منافع وہ بھی مہینے بعد حاصل ہوتا ہے۔ حصص کے بازار میں حصص کی خرید و فروخت بنیادی نہیں ہوتی ہے بلکہ اس کا تبادلہ ثانوی مارکیٹ میں ہوتا جہاں توقعات یعنی سٹہ کی بنیاد پر حصص کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ ۱۰۰ روپے بنیادی طور پر آٹے کی خریداری میں انویسٹ ہو گیا۔ جس کا متوقع منافع ایک ماہ بعد حاصل ہو گا جب یہ آٹا مارکیٹ میں بیچ دیا جائے گا۔ مگر بکر ایک ثانوی مارکیٹ قائم کرے گا کہ آٹا تو بکتا رہے گا مگر اس کے حصص کی خرید و فروخت بھی جاری رہے گی۔ جس سے پیداور کا کوئی تعلق نہیں ہو گا۔ اب بکر حصص جو کاغذ کی صورت میں ہوں گے بیچنا اور خریدنا شروع کرے گا۔ ان حصص کی قدر کسی بھی وجہ سے بڑھ جائے جیسا کہ یہ توقع بڑھ جائے کہ آٹے کی قیمت بڑھ رہی ہے، یا کہ کوئی بھی اس کے حصص تیزی سے خرید لے جس سے اس کی مالیت میں اضافہ ہو جائے تو اس کی قیمت ۱۰۰ سے ۱۱۰ ہو جائے اور بکر اس کو مزید خریدے اس توقع پر کہ اس کی مالیت بڑھ رہی ہے۔ اور جب اس کی مالیت ۱۵۰ تک پہنچ جائے تو بکر اس کو بیچنا شروع کر دے جس سے اس کی مالیت میں کمی آئے گی اور یہ توقع عام ہو جائے گی کہ حصص کے دام کم ہو رہے ہیں۔ پھر اس کے دام ۱۰۰ روپے یا اس سے کم ہو جائیں تو اس کو خرید لے اس طرح منافع کے علاوہ وہ سٹہ کے ذریعہ خوب سرمایہ بنائے گا۔

حصص کی مارکیٹ کے علاوہ بھی ایک اور طرح سے قرضے کی لین دین کر سکتے ہیں جس کو بونڈ مارکیٹ کہتے ہیں یہ کٹوتی یا ڈسکاؤنٹ کی بنیاد پر قرضہ دیتی ہے۔ ۱۰۰۰ روپے کے قرض کے

لیے ۱۰۰ روپے کے بونڈ جاری کیے جائیں گے۔ ایک ماہ کی مدت کے لیے جس کو اگر ۱۰ فیصد ڈسکاؤنٹ کیا جائے تو وہ ۹۰ روپے میں آج خریدے جائیں گے اور ایک ماہ بعد ۱۰۰ روپے میں زید کو واپس کر دیے جائیں گے۔ یہ بانڈ مارکیٹ کارپوریٹ کی سطح پر بھی ہوتی ہیں مگر زیادہ تر حکومتی سطح پر ہوتی ہے۔

ایک خرچہ کی ضرورت تو زید کو تھی۔ ایک خرچہ کے ضرورت حکومت کو بھی ہوتی ہے جو کہ وہ محصولات سے وصول کرتی ہے مگر اگر اخراجات کا حجم آمدن سے زیادہ ہو تو حکومت بکر سے کہے گی کہ اس کو ۱۰۰۰ روپے دے جس کے لیے حکومت ۱۰۰ روپے کے بانڈز جاری کرے گی جس کو حکومت ایک ماہ کے لیے ۹۰ روپے میں بیچے گی۔ ایک ماہ بعد بکر اس بانڈ کو ۱۰۰ روپے میں واپس حکومت کو بیچ سکتا ہے۔ اس ۱۰۰ روپے کو پورا کرنے کے لیے حکومت مزید ٹیکس لگائے گی مگر کیوں کہ اتنا ٹیکس لگا نہیں سکتی اس لیے ۱۰۰ روپے کے سود اور اگلے سال کے ۱۰۰۰ روپے کے خسارہ کو پورا کرنے کے لیے وہ اگلے سال ۱۱۰۰ روپے کے بانڈ جاری کرے گی۔ اور یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ جس سے آج دنیا کا ہر ملک کھربوں روپے کا مقروض ہو گیا ہے۔

اب مختلف نوعیت، میعاد (duration)، شرح کے قرضے ہر لمحہ دنیا بھر میں خریدے اور بیچے جا رہے ہیں۔ یہ قرضے صرف اندرون ملک نہیں دیے اور لیے جاتے بلکہ بیرون ملک بین الاقوامی طور پر بھی ان کی تجارت ہو رہی ہے۔ اس میں جس مارکیٹ کا عمل دخل ہوتا ہے اس کو کرنسی کے تبادلہ کی مارکیٹ (forex market or foreign exchange market) کہتے ہیں جہاں پر غیر ملکی کرنسیوں کی تجارت ہوتی ہے۔ ایک کرنسی کی قدر دوسری کرنسی میں کیا ہو گی یہ ہر لمحہ تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ اس لیے جب قرضے کی لین دین دو مختلف کرنسیوں میں ہو گی تو ان کے درمیان تبادلے کی شرح اہمیت کی حامل ہو گی اور یہ قدر کیا ہو گی اس پر سٹہ ہوتا ہے۔ اگر یہ توقع ہو کہ ڈالر کی شرح ۱۰۰ روپے فی ڈالر سے بڑھ کر ۱۱۰ روپے فی ڈالر ہو جائے گی تو بکر ۱۰۰۰ روپے کے ۱۰ ڈالر خرید کر اس کو جیسے ہی ۱۱۰ کا

ہو گا بیچ دے گا۔ پھر اس کی قیمت کم یا مستحکم ہو گی تو پھر اگر پونڈ کی قیمت بڑھ رہی ہو تو وہ پونڈ خرید لے گا اس طرح وہ ہر لمحہ دنیا کی کرنسیوں کا تبادلہ کر کے اپنے سرمائے کو بڑھانے کی جستجو میں لگا رہ سکتا ہے۔

بکر اور زید کو مالیاتی مارکیٹ سرمایہ کاری کے بہت سے مواقع فراہم کرتی رہتی ہے جس کی وجہ سے ان دو رجحانات میں سے کسی ایک رجحان کا پایا جانا لازمی ہوتا ہے: یا تو یہ پر خطر سرمایہ کاری کو پسند کریں گے یعنی رسک پسند[۲] ہوں گے یا یہ محفوظ سرمایہ کاری[۳] کرنے والے ہوں گے۔ چوں کہ اس مارکیٹ میں ہر لمحہ قرض کی شرح میں تبدیلی آتی رہتی ہے اور کوئی بھی ایک مارکیٹ پر اکتفا نہیں کر سکتا ہے۔ اس لیے محفوظ سرمایہ کاروں سے فنڈ لے کر پر خطر سرمایہ کاروں کو دینے کے لیے ایک ادارتی صف بندی کی جاتی ہے جہاں پر ان دونوں کے درمیان معاہدوں کو بیچا اور خریدا جاتا ہے اس مارکیٹ کو استخراجی یا ڈیریویٹیو مارکیٹ کہتے ہیں[۴]۔ اس میں مسلسل قرض کے معاہدوں کا تبادلہ ہوتا رہتا ہے۔ اس میں انفرادی طور پر بھی حصہ لے سکتے ہیں مگر اس میں فنڈ مینجر کی ضرورت ہوتی ہے جو آپ کے فنڈ کو مسلسل منافع بخش سرمایہ کاری میں لگاتا رہتا ہے۔ استخراجی قوتیں بونڈ، حصص، اشیا، پراپرٹی وغیرہ ہیں۔ بکر اور زید کے درمیان ۱۰۰۰ روپے قرض کا معاہدہ ہے۔ اب بکر ایک محفوظ سرمایہ کار ہے تو وہ یہ سوچے گا کہ اگر آٹے کے دام کم ہو گئے تو سال بھر بعد اس کو نقصان ہو گا۔ تو وہ آٹے کے معاہدے کو قاسم کے ہاتھ استخراجی مارکیٹ میں ۵ روپے کلو کے حساب سے بیچ دے گا قاسم کو ۱۰۰۰ کے بجائے ۵۰ روپے دینے ہوں گے۔ اگر آٹے کی قیمت ۱۱۰ روپے ہو گئی تو قاسم کو ۱۰۰ روپے منفی ۵۰ روپے یعنی ۵۰ روپے کا فائدہ ہو گا اور زید کو ۵۰ روپے جو قاسم سے لیے تھے اس کا ہی فائدہ ہو گا اگر آٹے کے دام ۹۰ روپے ہو گئے تو قاسم نے جو ۵۰ روپے دیے تھے اس کا نقصان ہو گا بکر کو ۱۰۰ روپے منفی ۵۰ روپے (جو پہلے ہی

---

[2] Risk lover: Those who love to take risk
[3] Risk averse: Those who do not take risk, play safe
[4] Participants in derivative market: Hedgers, Speculators, Arbitragers Types of Derivatives: Forward/future contracts, Options, Swaps.

قاسم سے لے چکا ہے) یعنی ۵۰ روپے کا نقصان ہو گا۔ زید یہ معاہدہ ۱۰ افراد کو بھی بیچ سکتا ہے۔ جس سے نقصان ہونے کی صورت میں ۱۰۰ روپے کا نقصان ہو گا اور ۵۰۰ روپے اس کو پہلے ہی (۵۰ روپے فی معاہدہ) مل چکے ہیں اس طرح اس کو ۴۰۰ روپے کا فائدہ ہو گا۔ اور فائدہ کی صورت میں اس کو ہر ایک کو ۱۰۰ کے حساب سے ۵۰۰ روپے دینے ہوں تو اس کا کوئی نقصان یا فائدہ نہیں ہو گا۔ استخراجی مارکیٹ زیادہ تر اشیا کے بجائے حصص میں تجارت کرتی ہیں۔ یہ تو آپشن کا طریقہ ہے اس کے علاوہ مستقبل یعنی فارورڈ/فیوچر معاہدے اور اس کے علاوہ سویپ میں بھی سرمایہ کاری کی جاتی ہے۔ حصص کے بازار میں استخراجی بازار میں فرق یہ کہ اول الذکر میں سرمایہ کاری بہت زیادہ اور طویل المیعاد ہوتی ہے جبکہ اس کے برخلاف موخر الذکر میں سرمایہ کاری بہت قلیل اور قلیل المدت ہوتی ہے۔

حاصل بحث نقطہ یہ ہے کہ زید ۱۰۰۰ روپے کا قرضہ لینے بکر کے پاس گیا تھا لیکن اب وہ اس مشکل میں گرفتار ہے کہ ۱۰۰۰ روپے ۱۰۰۰ روپے کے قرضے بن گئے۔ ان قرضوں پر کارپوریشن کھڑی ہو گئیں۔ قرضوں کو قرضوں کے عوض بیچا جانے لگا۔ ۱۰۰۰ روپے کئی گردشوں کے بعد کئی گُنا قرضوں میں بدل گئے ہیں۔ پوری معیشت و ریاست قرضوں کے چنگل میں پھنس گئی ہے۔ اب آپ کاروبار کریں، خرچ کریں آپ کو مالیاتی یا فنانشل مارکیٹ کا سہارا لینا پڑے گا۔ اب ہر لمحہ جس نے پوری دنیا کو قابو کیا ہوا ہے اور جس کے منتظر ہم ہر لمحہ ہوتے ہیں وہ خبر ہوتی ہے کہ اس لمحہ کا کٹوتی یا ڈسکاؤنٹ ریٹ کیا ہے اور اس کو کیسے منظم کیا جائے؟ اس ریٹ یعنی قرضہ کی قیمت کیا ہو گی اس کا پیمانہ کیا ہو گا۔ مارکیٹ اس کو کیسے منظم یا ریگیولیٹ کرے گی۔ کن کے ہاتھوں میں اس کی باگ ڈور ہے۔ یہ وہ سوالات ہیں جس سے پوری دنیا متاثر ہو رہی ہے۔ طوالت کے پیش نظر ہم نے اس کا تفصیلی ذکر نہیں کیا کہ زر اس مارکیٹ میں ایسا پھنستا ہے کہ خود اصل زر نہیں رہتا بلکہ زر خود قرض بن جاتا ہے اور قرض کی بنیاد پر ہی تشکیل پاتا ہے۔ قرض میں اصل ۱۰۰۰ روپے جب گردش کرتا ہے تو اصل بہت معمولی ہو جاتا ہے اور سود ہی سود رہ جاتا ہے۔ جس کو آپ کوئی بھی نام دے دیں وہ قرض کا

معاوضہ ہی ہوتا ہے۔

اسلامی معیشت یا اسلامی قرض کی معیشت کیا ہے؟

اسلامی معاشیات دانوں کا المیہ یہ ہے کہ وہ مالیاتی مارکیٹ کے اصولوں کو جانے بغیر اس میں اسلامی مالیات کی پیوند کاری کر رہے ہیں۔ وہ سودی قرض کو اجارہ و مرابحہ، اور دیگر بیوع سے تعبیر کر رہے ہیں۔ بونڈز کو صکوک کا نام دے رہے ہیں۔ حصص کے کاربار کو جائز تصور کر کے اسلامی کارپوریشن بنا رہے ہیں۔ اسلامی بینکاری کے عنوان سے مالیاتی مارکیٹ کی ترویج اور فروغ کے ضامن بن رہے ہیں۔

اب فرض کریں کہ زید اور بکر ایک دین دار طبقہ سے منسلک ہوگئے ہیں۔ یہ دونوں مالیاتی مارکیٹ کی اصل کو جانتے ہیں مگر اسلامی تمویلی آلات سے واقف نہیں ہیں۔ وہ اپنے مالیاتی مارکیٹ کے کاروبار کو بھی جاری رکھنا چاہتے ہیں جہاں وہ گھنٹوں اور دنوں میں پیسہ کما لیتے ہیں، مگر دل میں شرمندہ ہیں کیوں کہ ان کو سود کہ لعنت کا علم ہے۔ وہ دین دار طبقے میں اپنے آپ کو مجرم سمجھتے ہیں۔ تو وہ اس مالیاتی مارکیٹ جس کی باگ ڈور سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں ہے کے سلسلے میں ایسے علمائے کرام سے رجوع کرتے ہیں جو ان کو اس مارکیٹ میں رہتے ہوئے اسلامی طریقۂ تمویل سے روشناس کر دیں اور اس سلسلہ میں ان کو فتویٰ بھی فراہم کر دیں۔ اس کے لیے وہ مالیاتی ماہرین کے ساتھ شرعی مشیران / ایڈوائزرز کی خدمات بھی حاصل کر لیتے ہیں۔ اس طرح مارکیٹ کے ڈھانچے کو تبدیل کیے بغیر اس میں اسلامی آلات کی پیوند کاری کر دیتے ہیں۔ جس سے نہ صرف یہ کہ سرمایہ دار نہ مالیاتی مارکیٹ قائم رہتی ہے بلکہ اس کو وہ گاہک بھی مل جاتے ہیں جو کہ اسلامی ذہن کے حامل ہوں جو مالیاتی مارکیٹ خاص کر بینکوں کا رخ اس لیے نہیں کرتے کہ یہ سودی ادارے ہیں۔ اس رجحان کے تحت اسلامی مالیاتی مارکیٹ قائم کی جاتی ہے جس میں سود کو کرائے اور لیزنگ [۵] میں تبدیل کر دیا جاتا

[۵] بیع کی وہ قسم جس میں قیمت اور منافع معاہدہ کی بنیاد پر ہوتا ہے۔

ہے، بونڈ کو صکوک کا نام دیا جاتا ہے، انشورنس کو تکافل کہتے ہیں۔ جس اسلامی مالیاتی ادارے نے اس دور میں سب سے زیادہ مقبولیت حاصل کی ہے وہ اسلامی بینکاری ہے۔ اسلامی مالیاتی ادارے کو قائم کرنے کے لیے اسے اسٹیٹ بینک یا ایس ای سی پی (SECP) سے الحاق کرنا لازمی ہوتا ہے، جو کہ سودی ادارے ہیں۔ اسٹیٹ بینک سے الحاق کی سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ بینک اسٹاک ایکسچینج سے رجسٹر ہو کر ایک پبلک لمیٹڈ کمپنی قائم کرے اور اس کے کم از کم ۵۰ فیصد حصص[۶] پبلک سیکٹر میں بیچے جائیں اور وہ ثابت کریں کہ وہ ایک منافع بخش کاروبار کریں گے۔ اس کے لیے لازم ہے کہ ان کا ۵۰ برانچوں تک کا اندازہ شدہ / پیڈ اپ سرمایہ کم از کم ۱۴ ارب روپے[۷] کا ہو اور بینک دولت پاکستان جو کہ سودی ادارہ ہے، میں ایک اسلامی بینک کا شعبہ قائم کر کے اس کے تحت اسلامی بینکوں کو رجسٹرڈ کیا جاتا ہے۔ جہاں پر اسلامی بینک صکوک خریدتے ہیں جس کا ریٹ کائی بور کی بنیاد پر طے ہوتا ہے۔ اس پالیسی ریٹ پر ہر اسلامی بینک ایس بی پی سے تعلق رکھنے اور اس کے پاس ڈپوزٹ رکھوانے کے پابند ہیں۔ اسلامی بینک جب بھی کوئی معاہدہ کریں گے تو ان کو شرعی مشیر / ایڈوائزر سے سرٹیفیکیٹ لینا ہو گا کہ یہ معاہدہ شریعت کے مطابق ہے کہ نہیں۔ اب بنیادی مارکیٹ میں حصہ داروں / شیئر ہولڈرز سے اسلامی بینکوں کے سرمایہ حاصل کرنے میں تو کچھ اسلامیت نظر آتی ہے کہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک مجبوری ہے۔ لیکن کارپوریشن بنتے ہی شخصی ملکیت ختم ہو جاتی ہے اور اس کی حقیقی ملکیت سرمایہ کی ہو جاتی ہے۔ اسلامی بینکاری والے کارپوریشن اور حصص کی خرید و فروخت کو جائز سمجھتے ہیں (مفتی تقی عثمانی صاحب)[۸]۔ مگر ثانوی مارکیٹ میں اسلامی بینکوں کے حصص کی خرید و فروخت سٹہ کی بنیاد پر ہوتی ہے سو یہ کیسے جائز ہوا۔ اسلامی بینک اور تمام بینک یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ بچتوں کو استعمال کر کے ملکی انویسٹمنٹ کو

---

[۶] کہتے ہیں shares حصص کو انگریزی میں شیئرز

[۷] بینک دولت پاکستان ۲۰۱۵ سرکولر Annexure-II to IBD Circular No. 02 of 2004

[۸] اسلام اور جدید معیشت و تجارت تقی عثمانی صفحہ ۸۵

فروغ دیتے ہیں تاکہ اس کے نتیجے میں ملکی پیداوار اور روزگار میں اضافہ ہو۔ مگر اس کے برخلاف بینک اپنے منافع میں اضافے کے لیے بچتوں کو اس طرح استعمال کرتے ہیں جس سے ان کا کاروبار فروغ پائے اور ان کے حصص کی مالیت میں اضافہ ہو اور ان کے گاہکوں یعنی کھاتے داروں کو بھی جلد از جلد منافع میں حصہ ملے۔ اس لیے ان کو فوری منافع کے لیے مالیاتی مارکیٹ کا سہارا لینا پڑتا ہے اور صکوک اور کرائے کے معاہدے کائی بور اور لائی بور کی بنیاد پر کرنے پڑتے ہیں۔

جدول ا: میزان بینک کی بیلنس شیٹ					
فیصد	۲۰۱۶ (ملین روپے میں)	ادائیگیاں / ذمہ داریاں	فیصد	۲۰۱۶ (ملین روپے میں)	اثاثے وصولیاں
ا	۹۱۳۱	بل کی ادائیگیاں	۹	۵۶۰۳۷	کیش اور بیلنس ٹریژری بینک کے ساتھ
۵	۳۲۰۰۵	مالیاتی اداروں کو ادائیگیاں	۲	۱۲۰۲۱	دیگر بینکوں میں بیلنس
۸۶	۵۶۴۰۲۴	دیگر کھاتوں میں ڈپازٹ	۲۰	۱۲۹۱۱۵	مالیاتی اداروں سے وصولیاں
ا	۷۰۰۰	جزوی صکوک	۲۰	۱۳۰۱۵۶	انویسٹمنٹ
	۱۳۶۲	محصولات کی ذمہ داریاں	۴۷	۳۱۱۵۳۰	اسلامی مالیات اور اس سے متعلق اثاثے
۲	۱۳۷۷۰	دیگر ذمہ داریاں	ا	۸۹۲۵	جاری منجمد اثاثے
					محصولات کے

					اثاثے
					دیگر اثاثے
۹۵	۳۲۷۲۹۳	کل وصولیاں	۱۰۰	۶۵۷۷۶۷	کل اثاثے
Source: Annual Report 2016 Meezan Bank					

اگر ہم اسلامی بینکوں کے اثاثوں اور ادائیگیوں / ذمہ داریوں پر نظر ڈالیں، مثلاً ہم میزان بینک کو کیس اسٹیڈی کے طور پر لیں، تو ہم جدول(۱) میں دیکھ سکتے ہیں کہ ذمہ داریوں کا ۸۶ فیصد کھاتوں پر مبنی ہے۔ میزان بینک کو ۲۰۱۶ میں ادائیگیوں یا ذمہ داریوں کی مد میں جو رقوم حاصل ہوئیں وہ تقریباً ۶۲۷ بلین روپے تھیں جس کا ۸۶ فیصد حصہ اس کو کھاتوں سے حاصل ہوا جو کہ تقریباً ۵۶۴ بلین روپے تھا۔ یعنی بینک کا اپنا حصہ بہت معمولی ہے۔ صرف شیئر آف کیپٹل یعنی بینک کے شیئر ہولڈرز کا سرمایہ محض ۵ فیصد ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو کھاتے لیے جاتے ہیں ان کا استعمال کہاں ہوتا ہے؟ یہ ہمیں اثاثوں سے پتہ چلے گا۔ ان کھاتوں میں جو رقم آتی ہے اس کا پہلا استعمال نقد یعنی کیش کی صورت میں ہوتا ہے جو بینک (یہ علاقائی اور بیرونی کرنسی دونوں میں ہوتا ہے) میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کیش کا ایک حصہ بینک دولت پاکستان اور نیشنل بینک کے پاس ہوتا ہے۔ یہ ریزور بینکوں کے لیے لازمی ہوتا ہے۔ اس کی مقدار کا تعین ایس بی پی کرتا ہے۔ اس پر بینک کو کوئی منافع حاصل نہیں ہوتا ہے۔ اس کا اثاثوں میں ۹ سے ۱۰ فیصد حصہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر بینکوں، اندرون ملک اور بیرون ملک دونوں جگہوں پر، جاری اور عند الطلب کھاتوں میں بیلنس رکھے جاتے ہیں جس سے بینک کو منافع بھی حاصل ہوتا ہے۔ ان کا کل اثاثوں میں ۲ فیصد حصہ ہوتا ہے۔ جس میں اس بینک کے اضافی محفوظات کو استعمال کرتے ہیں یہ طریقہ بالکل رسمی / کنونشنل بینکوں کی طرح کا ہوتا ہے۔ اس طرح یہ بینک دوسرے بینکوں کا قرضہ خریدتے ہیں۔

Table 2: Share of different modes in Islamic financings and related assets 2016	
FINANCING MODES	%age
مشارکہ متناقصہ	31.86
رننگ مشارکہ اور مشارکہ	24.73
استصناع	12.94
اجارہ	7.96
مرابحہ	5.51
مساومہ	4.75
سلم بل	4.12
وکالۃ الاستثمار	3.99
تجارہ	1.87
کموڈٹی سلم	0.63
دیگر	1.63
Source: Annual report 2016 Meezan Bank	

جیسا کہ جدول(۲)میں دیکھا جاسکتا ہے کہ اس کے علاوہ دیگر مالیاتی اداروں کو جو قرضے اور ایڈوانس دیے ہوتے ہیں ان سے ملنے والے منافع اور اصل کی واپسی سے بھی اثاثے حاصل ہوتے ہیں جو کہ کل اثاثوں کا ۲۰ فیصد ہوتے ہیں۔ اس میں سب سے زیادہ حصہ بیع مؤجل کا ہوتا ہے جو کہ دیگر کھاتہ دار بینکوں اور مرکزی بینک کے ساتھ محفوظ اور غیر محفوظ معاہدات پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ معاہدات ایک مہینے سے لے کر تین ماہ تک کی مدت کے درمیان کے

ہوتے ہیں۔ ان میں صکوک کو موجودہ قیمت پر خریدنے کا معاہدہ کیا جاتا ہے اور اس کو قرضہ کے معاہدے کی مدت ختم ہونے کے بعد خریدا جاتا ہے۔ اس کو مالیاتی ادارے گروپ سے خریدے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ بہت محدود سطح پر مشارکہ اور مضاربہ میں بھی سرمایہ کاری کی جاتی ہے۔ اس میں شریعت کے تحت کاروباری پول بنا دیا جاتا جس میں طے شدہ منافع و نقصان کے تناسب سے معاہدات ہوتے ہیں۔ یہ لین دین سب مالیاتی مارکیٹ میں ہوتا ہے۔ اس کا کوئی تعلق پیداواری مارکیٹ سے نہیں ہوتا۔ اس طرح ایک بینک دوسرے بینک کا قرضہ خریدتا ہے۔

چوتھی مد جہاں سے اثاثے حاصل ہوتے ہیں وہ انویسٹمنٹ یعنی سرمایہ کاری کی ہے۔ جس کا حجم کل اثاثوں میں ۲۰ فیصد ہے۔ یہ سرمایہ کاری / انویسٹمنٹ بینک کہاں کرتا ہے؟ یہ انویسٹمنٹ جس کو بلاشبہ سرمایہ کاری کہہ سکتے ہیں یہ سکیورٹیز اور حصص میں ہوتی ہے۔ یہ وفاقی حکومت کے اجارہ صکوک اور بیع مؤجل کی خرید و فروخت ایس بی پی کے ذریعہ کرتے ہیں۔ البرکہ بینک، امریلی اسٹیل، کے الیکٹرک وغیرہ کے صکوک سرٹیفیکیٹ خریدتا ہے۔ اس کے علاوہ عالمی بونڈ مارکیٹ سے صکوک کو خریدتا ہے، جیسے قطر اسلامی بینک، فرسٹ گلف بینک وغیرہ کے۔ یہ صکوک اور حصص ۱ ماہ سے ۶ ماہ کی مدت کے لیے ہوتے ہیں جن کی مالیت کائی بور سے لی جاتی ہے۔

پانچویں مد اسلامی مالیاتی اور اس سے متعلق اثاثے ہیں ان کا حجم ۴۷ فیصد ہے۔ اسلامی مالیاتی اثاثے مرابحہ، اجارہ، مشارکہ متناقصہ، مشارکۃ الاستصناع وکالۃ الاستثمار ہیں۔ اس مد میں ۳۱۱ بلین روپے کے لگ بھگ اثاثے ہیں جس میں ۸۰ بلین مشارکۃ الاستصناع ہیں جو گھروں اور دیگر کرائے کی مد میں استعمال ہوتے ہیں۔ یہ سب کے سب کرائے اور لیزنگ کے معاہدے ہیں۔ اس میں نہ ہی قرض حسن (لبیک قرض حج و عمرہ کے لیے ہے جو کہ صرف ۵۸۷۱ روپے ہے)، اور نہ ہی مضاربت اور مشارکت کے کوئی معاہدے ہیں۔ مشارکہ متناقصہ کو مشارکہ نہیں کہہ سکتے کیوں کہ اس میں نفع و نقصان کا عقد نہیں ہوتا ہے بلکہ یہ لیزنگ کا

ایک اسلامی نام ہے۔ میزان بینک نے زراعت، جنگلات اور مچھلی کی صنعت میں ۱۲ فیصد، بجلی، تیل، گیس اور پانی کے شعبوں میں ۲۳ فیصد، ٹیکسٹائل کے شعبہ میں ۲۰ فیصد اور انفرادی صرف کے لیے کل ۸ فیصد سرمایہ کاری اسلامی اثاثوں میں کی ہے۔ مگر یہ سرمایہ کاری کرائے اور لیزنگ کے ذریعہ ہی کی ہے۔

اسلامی بینک اپنے منافع کے لیے کوئی بھی سرمایہ کاری، حتیٰ کہ پیداواری سطح پر بھی، خطرہ مول (رسک) لیتے ہوئے نفع و نقصان کے تحت یعنی شراکت کی بنیاد پر نہیں کرتے۔ ان کا پورا خدوخال (اسٹرکچر) روایتی (conventional) بینکوں جیسا ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ اس میں جو معاہدے مالیاتی مارکیٹ میں کیے جاتے ہیں انہیں ایک سرٹیفکیٹ کے ذریعے جو اپنے خادم مفتیوں کے ذریعے حاصل کیے جاتے ہیں، شرعی جواز فراہم کیا جاتا ہے۔ چوں کہ تمام معاہدات کرائے پر مبنی ہیں اس لیے ان کو کٹوتی کی شرح (ڈسکاونٹ ریٹ) کی ضرورت ہوتی ہے جس کے ذریعہ وہ سرمایہ کاری کر سکیں اور یہ ریٹ پاکستان میں کائی بور ریٹ سے طے کیا جاتا ہے۔ اس لیے جب بھی اسلامی بینکوں کے کرائے یا لیزنگ کے ریٹ کا سودی بینکاری کے کائی بور ریٹ (KYBOR) سے موازنہ کریں گے تو اس میں مطابقت پائی جائے گی۔ سرہان اور جاشوا نے ایران اور ملیشیا کے اسلامی اور روایتی / کونونشل بینکوں کے نفع و نقصان کھاتوں[9] کا موازنہ کیا تو انہوں نے روایتی / کونونشل بینک کے ڈپازٹ ریٹ اور اسلامی بینک کے بچت ڈپازٹ ریٹ میں ۹۱ سے ۹۲ فیصد مطابقت پائی۔ اگر پاکستان میں دونوں کے درمیان موازنہ کیا جائے تو یہی مطابقت پائی جائے گی کیوں کہ دونوں ادارے ایک ہی سرمایہ دارانہ ماحول میں منافع کی غرض سے کام کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے مسابقت کا جذبہ رکھتے ہیں۔

اسلامی بینک جب بھی جامد شرح پر کوئی کوئی شے اپنے گاہک / کلائنٹ کو بیچتا ہے تو وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ پہلے اس شے کی ملکیت حاصل کرتا ہے اور پھر اس کو بیچتا ہے۔ جس سے یہ لگتا

[9] Charap, Serhan Cevik and Joshua, 2011, page 3.

ہے کہ بینک وہ شے مادی طور پر خرید تا ہے۔ عام کاروبار میں جب بھی کوئی چیز خریدی جاتی ہے وہ فہرست / انونٹری (Inventory) میں شامل ہو جاتی ہے۔ لیکن اسلامی بینکوں میں مرابحہ کے تحت خریدی گئی اشیا کو انونٹری کے طور پر درج نہیں کیا جاتا بلکہ اسے "مرابحہ وصولی" (Murabaha Receivable) کے طور پر ریکارڈ کیا جاتا ہے۔ جو کہ ایک مالیاتی، نہ کہ خرید و فروخت کا، عمل ہے۔ چونکہ بینک کا اصل مقصد براہ راست تجارت نہیں بلکہ مالیاتی خدمات فراہم کرنا ہوتا ہے، اس لیے اس کا اصل اثاثہ نقد رقم اور قابل وصول ادائیگیاں (Receivables)، نہ کہ مادی اشیا ہوتی ہیں۔

مرابحہ وصولی اور انونٹری میں فرق

اسلامی بینکنگ میں مرابحہ ایک عام مالیاتی طریقہ کار ہے جس میں بینک کسی شے کو خرید کر منافع کے ساتھ اپنے گاہک / کلائنٹ کو فروخت کرتا ہے۔ اس کے برعکس روایتی کاروباری ادارے جب کوئی چیز خریدتے ہیں تو جب تک کہ وہ اسے آگے فروخت نہ کر دیں اسے انونٹری (Inventory) کے طور پر رکھتے ہیں۔ لیکن اسلامی بینک میں مرابحہ کے تحت خریدی گئی اشیا کو انونٹری کے طور پر درج نہیں کیا جاتا بلکہ اسے "مرابحہ وصولی" (Murabaha Receivable) کے طور پر ریکارڈ کیا جاتا ہے۔ اس فرق کو درج ذیل نکات کے ذریعے واضح کیا جا سکتا ہے:

ا۔ اسلامی بینک کا کردار: تاجر یا مالیاتی ثالث؟

- روایتی کاروباری ادارے جب کوئی چیز خریدتے ہیں تو وہ اسے اپنی انونٹری میں شامل کرتے ہیں اور بعد میں فروخت کرتے ہیں۔
- اسلامی بینک کسی شے کو محض عارضی طور پر خریدتا ہے اور فوری طور پر کلائنٹ کو بیچ دیتا ہے، اس لیے یہ تاجر نہیں بلکہ مالیاتی ثالث (Financial Intermediary) کا کردار ادا کرتا ہے۔ اس لیے کسی شے کی ملکیت نہیں لے سکتا بلکہ وہ اس شے کے عوض زر ہی دیتا ہے اور اس کی وصولی کرتا ہے۔ اس

زر کی ادائیگی اور وصولی کے اوپر جو بھی زائد رقم وصول کرتا ہے وہ زر کا کرایہ (سود) ہوتا ہے نہ کہ شے کا کرایہ۔

۲۔ اکاؤنٹنگ ٹریٹمنٹ: مرابحہ وصولی بمقابلہ انونٹری

مندرجہ ذیل جَدْوَل میں اسلامی بینکاری اور کاروبار میں فرق کو واضح کیا گیا ہے کہ اسلامی بینکاری کی بیلنس شیٹ میں برخلاف روایتی کاروبار کی بیلنس شیٹ کے مالی اثاثے ہوتے ہیں نہ کہ مادی اثاثے۔

پہلو	اسلامی بینک (مرابحہ وصولی)	روایتی کاروبار (انونٹری)
ملکیت کا دورانیہ	عارضی، بینک فوری فروخت کرتا ہے	لمبے عرصے تک ذخیرہ رکھ سکتا ہے
ریکارڈنگ کا طریقہ	مرابحہ وصولی کے تحت درج ہوتی ہے	انونٹری (Inventory) کے تحت درج ہوتی ہے
Book Value	اصل قیمت + منافع پر درج ہوتی ہے	خریداری قیمت پر درج ہوتی ہے
مالی حیثیت	مالی اثاثہ (Financial Asset)	مادی اثاثہ (Physical Asset)
مالیاتی رپورٹ میں ظہور	بیلنس شیٹ میں قابل وصولی رقم کے تحت ظاہر ہوتا ہے	بیلنس شیٹ میں موجودہ اثاثے کے تحت انونٹری میں شامل ہوتا ہے

اسلامی بینک نہ ہی کسی شے کی خریداری کر کے اس کا مالک ہوتا ہے اور نہ ہی اس کا کوئی مال اس کے کاروبار میں استعمال ہوتا ہے۔ ادائیگیوں / ذمہ داریوں کا ۸۶ فیصد حصہ ڈپازٹ کا ہے۔ اسلامی بینک دو مدوں میں ڈپازٹ یا کھاتے رکھتے ہیں ایک قرض دوسرا مضاربہ اس طرح بینک ایک وکیل اور مضارب کے طور پر کھاتے استعمال کرتا ہے۔ بینک کے جاری کھاتے جو کہ قرض کہلاتے ہیں بینک ان میں کھاتے داروں کا وکیل ہوتا ہے اور بچت کھاتوں میں مضارب۔ جب بینک کا اپنا کوئی کاروبار نہیں ہے تو وہ مضارب کیسے ہوا؟ وہ تو محض واسطہ ہے فنڈ کو کاربار میں لگانے کا۔ قرض بینک کے کرنٹ اکاؤنٹ اور مضاربت بچت اور جامد اکاؤنٹ پر مبنی ہوتے ہیں۔ کرنٹ اکاؤنٹ پر کھاتے دار کا کوئی منافع یا نقصان نہیں ہوتا مگر بینک اس کو

اپنی ایکوٹی تصور کر کے اس پر منافع حاصل کرتا رہتا ہے۔ مضاربت میں کھاتے دار رب المال ہوتے ہیں اور بینک مضارب اس صورت میں منافع کسی بھی شرح سے طے ہوتا ہے جو کہ ۵۰ فیصد سے زیادہ نہیں ہوتا۔ نقصان کی صورت میں نقصان تمام کھاتے داروں میں تقسیم ہو جاتا ہے[10]۔ یہ بات سرہان اور جوشوا نے ثابت کی ہے کہ اسلامی بینک روایتی / کنونشل بینکوں کے طریقہ کار کو اپنا کر اپنے ایسٹس پی ایل ایس اکاؤنٹ کے بجائے قرض کے مماثل آلات کا استعمال کرتے ہیں جن میں جامد یا فکس ریٹرن ملتا ہے[11]۔ اسلامی بینک اپنے اثاثوں کے لیے قرض کی طرز کے آلات کا استعمال کرتا ہے جبکہ اپنے استعمال (آپریشن) کے لیے شراکت یا قرض کے ذریعہ فنڈ حاصل کرتا ہے۔ یعنی ایکوٹی شراکت اور قرض حسن کے ذریعہ حاصل کرتا ہے اور کھاتے داروں کے ساتھ مضاربت کا معاہدہ کرتا ہے۔ آمدن کے حصول کے لیے قرض کے طرز کے غیر پی ایل ایس معاہدات کرتا ہے۔ مگر منافع کی تقسیم نفع اور نقصان کے اصولوں پر کرتا ہے۔ اپنا سرمایہ لگائے بغیر کھاتے داروں کو رب المال اور بینک مضارب بن کر تمام نقصان کھاتہ داروں کے ذمہ کر دیتا ہے۔ اور منافع میں ۵۰ فیصد سے زائد حصہ لے کر حصہ داروں میں آپس میں تقسیم کر دیتا ہے۔

اسلامی بینکاری میں بھی کریڈٹ کی تخلیق (credit creation) ویسے ہی ہوتی ہے جیسا کہ ایک روایتی / کنوینشنل بینک میں ہوتی ہے۔ اصل رقم جس اثاثے (asset) کی صورت میں بھی ہوتی ہے اس کو بار بار فروخت کیا جاتا ہے۔ یہ عمل ریزرو تناسب (reserve ratio) کے حساب سے ہی زر کی ترسیل میں کئی گنا اضافہ کا موجب بنتا ہے۔ اس طرح سودی بینک سے جو چیک اسلامی بینک میں آتا ہے وہ اسلامی بینک کے کھاتے میں لکھا جاتا ہے، مگر یہ نہیں معلوم کہ یہ رقم کہاں سے آئی۔ اسی قرض دار کی قرض کی رقم کو اسلامی بینک اپنی ذمہ داری بنالیتا ہے مگر یہ ذمہ داری وہ اثاثوں میں ڈال کر کسی اور کو اپنی رقم بنا کر دے دیتا ہے۔

[10] Annual report Meezan bank page 146
[11] Annual Report Meezan bank page 20

فرض کریں زید کو نیشنل بینک سے سودی قرضے کا اجرا ہوا جو کہ نیشنل بینک (این بی پی) کے اثاثے اور زید کی ذمہ داریوں میں شامل ہو گیا کہ زید کو یہ رقم سود کے ساتھ این بی پی کو ۳ سالوں میں واپس کرنی ہے۔ یہ رقم اگر چیک کے ذریعہ ملی ہے تو زید اس کو میزان بینک میں جمع کروا کر اپنی ذمہ داری کو بینک کی ذمہ داری بنادے گا۔ زید یہ رقم مختلف ایام میں بینک سے نکال کر بکر کو چیک کے ذریعہ ادائیگی کرتا ہے اس طرح میزان بینک بھی اسی رقم سے کاروبار کرتا ہے۔ یہ ہی رقم جب زید میزان بینک سے نکال کر بکر کو چیک کے ذریعہ دیتا ہے جو وہ حبیب بینک میں جمع کروا دیتا ہے۔ اب حبیب بینک، میزان، نیشنل بینک، زید اور بکر ایک ہی رقم استعمال کر رہے ہیں اور یہ سلسلہ ایک بینک سے دوسرے بینک میں چلتا چلا جاتا ہے۔ جس سے بینکاری کو فروغ ملتا ہے سود اور بلا سودی کا فرق ختم ہو جاتا ہے۔ رقوم سودی بینک سے اسلامی بینک کے درمیان گردش کرتی ہیں، قرض پر قرض دیا جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں زر کی ترسیل لامتناہی طور پر بڑھتی ہے جو کہ تورم (inflation)، بیروزگاری، کساد بازاری کا سبب بنتی ہے۔ اسلامی بینک ان تمام برائیوں کو نظر انداز کر کے اپنے منافع کو اسلامی قرار دے کر سرمایہ دارنہ نظام کا حصہ بن جاتا ہے۔

قرض کی معیشت سے نجات کی حکمت عملی: اسلامی تمویلی ادارے کا قیام

ایک اسلامی معاشرہ میں جہاں سرمایہ دارنہ رجحانات ناپید ہوں وہاں پر زید اور بکر کس طرح سے تعلقات استوار کریں گے ان کی ادارتی صف بندی کیا ہو گی۔ یہ ایک بہت سادہ سا عمل ہے۔

زید اور بکر کے باہمی تعلقات بھائیوں کی طرح ہوں گے جس میں ایک دوسرے سے سے غرض کے بجائے محبت ہو گی، ہر وہ تعلق روا رکھا جائے گا جس کی اسلامی شریعت اجازت دیتی ہے۔ اور اس سے اوپر اٹھ کر صلۂ رحمی کی جائے گی۔ زید اور بکر کے مالیاتی نوعیت کے

تعلقات چاہے انفرادی ہوں یا ادارتی تین نہج کے ہوں گے۔

یا تو بکر زید کو قرض حسن دے گا جس میں مال بکر کا ہو گا اگر منافع یا نقصان ہوا تو وہ پورا کا پورا زید کا ہو گا۔ مہینے کے بعد زید بکر کو پورے ۱۰۰۰ روپے واپس کر دے گا۔ چاہے ایک ماہ بعد قیمتوں میں کتنا ہی اضافہ کیوں نہ ہو جائے بکر زید سے زیادہ رقم کا مطالبہ نہیں کرے گا۔ اگر بکر کو اس رقم میں اضافہ کی ضرورت ہو گی تو وہ بکر کے کاروبار میں رقم مضاربت کے تحت دے گا یہ قرض نہیں ہو گا۔ بلکہ یہ شراکت ہو گی اصل کاروبار میں جس کا تعلق پیداوار یا خدمات سے ہو گا۔ ایک ماہ بعد زید آٹے کو بیچ کر جو منافع حاصل کرے گا وہ اس کا حصہ بکر کو دے دے گا۔ اگر نقصان ہوا تو بکر کا منافع اور اس کی رقم ضائع ہو گی مگر زید محنت اور منافع سے محروم رہے گا۔ ایک اور مالی تعلق بھی زید بکر سے کر سکتا ہے کہ بکر زید کو ۱۰۰۰ روپے انفاق کے تحت دے دے اس طرح زید کو یہ ۱۰۰۰ روپے لوٹانا نہیں پڑیں گے۔

یہ اسلامی مالیاتی بازار ہے جہاں پر قرض بیچا اور خریدا نہیں جاتا۔ جہاں کاروبار میں اصل معنی میں شراکت ہے حصص کی خرید و فروخت نہیں ہے۔ کوئی بونڈ یا صکوک کی مارکیٹ نہیں ہے۔ کوئی جبری انشورنس یا تکافل نہیں ہے۔ امداد باہمی ہے اگر کسی کی مالی مدد کی ضرورت ہوتی ہے تو اسلامی کمیونٹی اس کی مدد کے لیے امداد باہمی کے جذبہ کے تحت تیار ہوتی ہے (اور اس کی ادارتی شکلیں بھی ہوتی ہیں)۔ ایسے معاشرہ میں کسی بھی ڈسکاؤنٹ ریٹ کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ کسی سودی معیار کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب قرضہ جات ہر ثانیہ فروخت کیے جاتے ہوں اور ان کا تعلق پیدار سے نہ ہو۔ اس لیے یہ اپنے معیارات خود مارکیٹ سے اخذ کرتے ہیں۔ اسلامی معیشت میں قرض پر کاروبار نہیں ہوتا اس لیے کسی معیاری شرح کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کاروبار کسی بھی شعبہ میں خدمات یا پیداوار سے ہوتا ہے جو کہ معیادی ہوتا ہے، لمحوں کے لیے نہیں ہوتا اس لیے اس کی شرح کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہوتی اور اگر کبھی ضرورت بھی ہو تو اس شعبہ کی چند ماہ یا سال کی کارکردگی سے آسانی سے معیاری شرح کا تعین کیا جا سکتا ہے۔

اسلامی ریاست اور معاشرت کے نہ ہونے سے قرض، شراکت اور انفاق کے امور کو سرانجام دینے کے لیے کسی اجتماعیت کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ دھوکہ اور لاعلمی کی وجہ سے نقصان نہ اٹھانا پڑ جائے۔ امت مسلمہ کو دھوکہ بازوں اور سودی اداروں کے سپرد نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے اگر ادارتی صف بندی کی ضرورت ہے تو اس کو دینی اجتماعیت کے زیر نگرانی کرنا ہو گا۔ اگرچہ کام بہت معمولی ہے مگر افادیت کے اعتبار سے بہت غیر معمولی کام ہے۔

مالیاتی ادارہ کے قیام میں اس بات کا دھیان رکھنا ہے کہ قرض کی خرید و فروخت، چاہے وہ کسی بھی شکل میں ہو۔ اجارہ، مرابحہ، صکوک، حصص وغیرہ۔ نہ ہونے پائے۔ اصلی اشیا کے بازار میں سرمایہ کاری / انویسٹمنٹ ہو اور شراکت کے معاہدے کیے جائیں۔ ان معاہدات کو علمائے کرام کی سرپرستی میں منظم کیا جائے تاکہ فراڈ کا امکان کم از کم ہو۔ قرض کی معیشت سے عام مسلمانوں کو دور رکھا جائے۔ یہ کام بغیر ادارتی صف بندی کے ممکن نہیں ہے۔

اسلامی مالیاتی ادارہ کا قیام امداد باہمی کے اصول کے تحت ممکن ہے یہ غیر منافع بخش کام ہے جیسا کہ مدارس، مساجد، فلاحی کام ہے جو کہ چندے اور حق خدمت وصول کر کے ممکن ہے۔ اس کے لیے اسلامی بینک یا کارپوریشن قائم نہیں کی جاسکتی۔ اس نظام مالیات میں اسلامی بینکاری کے برخلاف کھاتے داروں اور تمویلی ادارے کے درمیان جو معاہدہ ہو گا وہ وکالت کا ہو گا۔ تمویلی ادارہ مضارب نہیں ہو گا۔ کھاتے دار رب المال ہوں گے اور جس کاروبار میں ان کی رقم لگائی جائے گی وہ مضارب ہوں گے۔ تمویلی ادارہ بحیثیت وکیل خدمات کا معاوضہ لینے کا مجاز ہو گا جو کہ اصل خرچ پر مبنی ہوں گا۔

اگر تمویلی ادارے کی بیلنس شیٹ بنائی جائے تو اس کی ادائیگیوں اور محفوظات کے طریقے / موڈ کچھ یوں ہوں گے:

ادائیگیاں	اثاثے
ابتدائی وسائل	جامد اندرون ادارہ اخراجات قرض وچندہ
قرض حسن	جاری ادارتی اخراجات قرض وچندہ

چندہ حق خدمت	جاری اداراتی اخراجات حق خدمت
محفوظات امانتیں	کیش
امانت کھاتے شراکتی کھاتے قرض حسن کھاتے، امانت کیش	امانت کیش شراکت کے تحت وسائل کی فراہمی قرض حسن کی فراہمی
انفاق	بیت المال اوقاف
شراکت فنڈ	شراکت داری
تکافل (امداد باہمی) فنڈ	امدادی رقم
دیگر ذمہ داریاں	دیگر اثاثے

چوں کہ یہ مفاد عامہ کا ایک ادارہ ہو گا اس لیے ابتدائی وسائل زیادہ تر چندے سے حاصل ہوں گے۔ اگر ضرورت ہوئی تو قرض حسن بھی لیا جاسکتا ہے۔ جاری اخراجات جو کہ بہت محدود ہوں گے، کاڈھانچہ مدارس و مساجد میں ہو گا۔ ان کا ایک حصہ اس کے لیے مختص کر دیا جائے گا جس کا کوئی کرایہ نہیں ہو گا۔ دیگر عملے میں صرف تکنیکی ماہرین کی ضرورت ہو گی۔ اس لیے جاری اخراجات بہت کم ہوں گے جن کو حق خدمت سے پورا کیا جائے گا۔ اگر حق خدمت زائد وصول ہوں گے تو ان کو واپس کر دیا جائے گا۔ یہ ایسی ذمہ داریاں ہوں گی جن کو واپس نہیں کرنا پڑتا۔ قرض کو یا تو چندے سے یا حق خدمت کے ذریعہ واپس کیا جائے گا۔

تمویلی ادارہ امانتیں بھی رکھے گا۔ امانتیں دو وجوہات کی وجہ سے رکھی جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ محفوظ رہیں۔ دوسرا ان رقوم کی ادائیگی کسی دوسری جگہ محفوظ طریقہ سے ہو سکے۔ اس لیے امانتیں کیش کی صورت میں مختلف برانچوں میں رکھی جائیں گی۔

تمویلی ادارہ ایک معاون ادارہ ہے۔ یہ اپنے کھاتے داروں لیے وکیل کا کردار ادا کرے گا۔

ان کے پیسیہ کو کاربار میں لگا کر ان کی بچتوں پر منافع دینے کی کوشش کرے گا۔ اس لیے کھاتے دار رب المال اور انویسٹر مضارب ہوں گے بیچ میں تمویلی ادارہ وکیل ہو گا جس کے لیے وہ حق خدمت وصول کر سکتا ہے۔

قرض امانت نہیں ہو گی اس لیے اس کو استعمال کے لیے بطور قرض دیا جاسکتا ہے۔ اس پر بھی حق خدمت وصول کی جاسکتی ہے۔

انفاق کی رقم کو فنڈ کے طور پر وصول کیا جائے گا اور اس کو بیت المال اور اوقاف کے دو شعبوں میں تقسیم کیا جایے گا۔ اس کا کچھ فیصد فوری ضرورت کی مد میں افراد اور اداروں کو فراہم کیا جائے گا اور کچھ فیصد حصہ شراکت فنڈ میں ڈال دیا جائے گا جہاں سے مستحق افراد اور اداروں کو ماہانہ بنیادوں پر وظیفے دیے جائیں گے تاکہ یہ افراد اور ادارے کچھ عرصہ میں خود کفیل ہو جائیں۔

تکافل فنڈ قائم کیا جائے گا جہاں پر مخیر حضرات رقوم بغیر جبر کے ڈالیں گے اور شراکت یا قرض میں آنے والے نقصانات کو اس فنڈ سے پورا کیا جائے گا۔ اس فنڈ کو وصول کرنے والے کا اس فنڈ پر کوئی دعویٰ نہیں ہو گا۔ یہ فنڈ کسی بھی طرح تکافل کے ادارہ کا کاروبار / بزنس نہیں ہو گا۔ اس میں وصول ہونے والی رقم کو شراکت کے تحت دے سکتے ہیں جو کہ اس ادارے کے فنڈ میں اضافہ کا موجب بن سکتی ہے۔ یہ رقم ضرورت مند افراد اور اداروں کے لیے مختص ہو گی۔

یہ ۱۰۰ فیصد محفوظ (reserve) تمویل (finance) ہو گی۔ جس کی باگ ڈور علمائے کرام کے پاس ہو گی۔ علماء کے تحت دیگر ماہرین مالیات کارہائے منصبی انجام دیں گے۔ اس کے اخراجات کو کم کرنے کے لیے پہلے سے قائم شدہ اسلامی اداروں، مساجد، مدارس اور خانقاہوں میں اس کی برانچز قائم کی جائیں گی۔ مدارس کے طلبہ اور علمائے کرام کو مالیات، کمپیوٹر اور انگریزی زنان کی تربیت دی جائے گی تاکہ اس کا عملہ اسلامی طرز کا حامل ہو اور عوام اس کو اجنبی نہ جانیں۔

اس ادارہ کی ذمہ داریاں یہ ہیں کہ وہ کھاتوں میں رقم وصول کرے اور ان کو منافع بخش کاروبار میں لگائے۔ منافع اس کا مقصد نہیں ہو گا بلکہ حلال مال کا حصول ان کا مقصد ہو گا۔ یہ مال کہاں لگے گا اس کے لیے پہلے سے ہی کریڈٹ پلاننگ ہو گی۔ اس فنڈ کو اس طرح استعمال کیا جائے گا کہ مسلمانوں کے کاروبار اور روزگار میں اضافہ ہو۔ اس کے لیے اس کے پاس ماہرین اور علمائے کرام کی ٹیم ہو گی جو کہ مختلف شعبوں مثلاً زراعت، صنعت، تجارت اور خدمات وغیرہ کا چنائو کرے گی اور یہ فیصلہ کرے گی کہ کس شعبے میں کتنا مال انویسٹ کرنا ہے۔ اس سرمایہ کاری کا مقصد نہ صرف یہ ہو گا کہ کھاتے داروں کو اپنی بچتوں پر مناسب منافع حاصل ہو سکے بلکہ یہ بھی ہو گا کہ ہماری معیشت کو اسلامی بنیادوں پر مال / فنڈ کی فراہمی ممکن ہو سکے۔ مالیاتی ادارہ صحیح معنی میں واسطے کا کام کرے گا اور فنڈ کو خود ہڑپ کرنے کے بجائے اس کے اصلی حقدار تک پہنچائے گا۔ اس سے اسلامی برادریوں کی پیداروار میں اضافہ ہو گا اور روزگار کے مواقع حاصل ہوں گے نیز مالی بحران سے ہماری معیشت محفوظ رہے گی۔

سال بھر میں اگر اثاثے زیادہ ہوں تو وہ تمویلی ادارے کی ایکویٹی میں تبدیل نہیں ہوں گے بلکہ وہ اثاثے اگر چندہ کی صورت میں وصول ہوئے ہیں تو وہ ادارہ استعمال کرے گا۔ یہ استعمال اپنے منافع کے لیے نہیں بلکہ اخراجات کو پورا کرنے کے لیے استعمال ہو گا۔ اس کے نتیجے میں حق خدمت وصول کی جائے گی یا اس کام کو وسعت دی جائے گی۔ حق خدمت اگر زائد وصول ہوئی تو اس کو واپس لوٹا دیا جائے گا۔

امانت کا استعمال صرف کھاتے دار کر سکتا ہے اس لیے یہ رقم ہر کھاتے دار کے نام سے بطور امانت رکھی رہے گی۔ جو اس کو جب بھی چاہے گا کسی بھی جگہ وصول کر سکتا ہے۔ جگہ کی تبدیلی پر اگر کوئی اخراجات آئیں تو ان کو تمویلی ادارہ وصول کر سکتا ہے۔

شراکت کی رقوم کو ایک پول میں جمع کیا جائے گا۔ ایک ملین کی رقم کا مثلاً ایک پول ہو گا۔ فرض کریں جنوری میں پول الف قائم ہوا جب اس میں ایک ملین کی رقم جمع ہو گئی تو پہلے سے مشاورت اور تجزیہ کے بنیاد پر اس کو کسی مخصوص پروجیکٹ یا کسی پروجیکٹ کے کسی مخصوص

شعبے مثلاً زراعت کے بیجوں کی خریداری، اسٹور ہاؤس کی تعمیر وغیرہ پر لگایا جائے گا۔ سال کے اختتام پر اس پر ہونے والے منافع کو تمویلی ادارہ اپنے اثاثوں کے تحت وصول کر کے اس کو تمام کا تمام اس پول میں موجود کھاتے داروں میں رقم کے حساب سے تقسیم کر دے گا۔ اسی طرح کا عمل قرض کے ساتھ ہو گا۔ قلیل مدت والے قرض کو صرف کیش کی کمی یا ترسیل کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح انفاق شراکت فنڈ کو ایک پول میں رکھ کر کسی بھی کاروبار میں لگا دیا جائے گا۔ اس کا منافع بیت المال اور اوقاف کو دے دیا جائے گا جو کہ اس کو مستحق افراد اور اداروں میں تقسیم کر دیں گے۔

تکافل فنڈ بھی کیش کی صورت میں رہے گا۔ جب کسی کاروباری فریق یا کھاتے داروں کی رقم ڈوب جائے گی اور ادارہ ان کو مستحق سمجھے گا تو اس رقم کو ان میں تقسیم کر دے گا جس سے ان کے نقصان کا خطرہ / رسک کم کیا جاسکے گا۔ اس فنڈ میں اگر زائد رقم بچتی ہے تو اس کو بھی کسی کاروبار میں لگا کر اس فنڈ میں اضافہ کیا جاسکتا ہے تا کہ زیادہ سے زیادہ افراد کو اس فنڈ سے مستفید کیا جاسکے۔

ضمیمہ

The Meezan "Group" consists of:
Holding Company: Meezan Bank Limited
Subsidiary Company: Al Meezan Investment Management Limited
Meezan Bank Limited (MBL / the Bank) ('Holding company') was incorporated in Pakistan on January 27, 1997, as a public limited company under the Companies Ordinance, 1984, and its shares are quoted on the Pakistan Stock Exchange (previously "Karachi Stock Exchange").
The Bank was registered as an 'Investment Finance Company' on August 8, 1997, carried on the business of investment banking as permitted under SRO 585(I)/87 dated July 13, 1987, in accordance of, and in conformity with the principles of Islamic Shariah. A 'Certificate of Commencement of Business' was issued to the Bank on September 29, 1997.
MBL was granted a 'Scheduled Islamic Commercial Bank' license on January 31, 2002 and formally commenced operations as a Scheduled Islamic Commercial Bank with effect from March 20, 2002 on receiving notification in this regard from the State Bank of Pakistan (the SBP) under section 37 of the State Bank of Pakistan Act, 1956. Currently, MBL is engaged in corporate, commercial, consumer, investment and retail banking activities.
The Bank was operating through five hundred and seventy-one branches as at December 31, 2016 (2015: five hundred and fifty-one branches). Its registered office is situated at Meezan House, C-25, Estate Avenue, SITE, Karachi, Pakistan.
Al Meezan Investment Management Limited (AMIML) ('the Subsidiary company') is involved in asset management, investment advisory, portfolio management, equity research, underwriting and corporate finance. MBL holds 65% of the share capital of AMIML

Bibliography

Balance sheet analysis: Islamic vs. Conventional. (2009). *New Horizon Islamic Banking Global perspective on Islamic banking and Insurace*, 1-5.

Charap, Serhan Cevik and Joshua. (2011). *The behavior of conventional and islmic bnk deposit retur in malysia and turkey.* IMF working paper.

Cornelisse, P. A. (1995). Islamic banking in practice: The case of Pakistan. *Development and Change*, 692-699.

Meezan Bank. (2016). *Annual Report.* Karachi: Meezan Bank.

Shariah Compliance. (2016). Retrieved from Strategic Plan for Islamic Banking Industry in Pakistan: http://www.sbp.org.pk/departments/pdf/StrategicPlanPDF/Appendix-%20Shariah%20Compliance.pdf

احیاءِ اسلامی تمویلی نظام: امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی فکر کی روشنی میں

سید محمد یونس قادری

ذیل میں امام غزالیؒ کی کتاب احیاء علوم دین (جلد دوم) کے باب کتاب آداب کسب و معاش سے اخذ کردہ نکات کو جدید ترتیب اور مختصر تشریح کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے۔

۱۔ کسبِ معاش کی فرضیت

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ جس طرح دیگر عبادات انسان پر فرض کی گئی ہیں، اسی طرح کسبِ معاش بھی تین طرح کے افراد کے علاوہ سب پر فرض ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک اسلامی معاشرہ اسی وقت قائم ہو سکتا ہے جب:

- مال حلال طریقے سے کمایا جائے۔
- آخرت (معاد) کو مال کمانے پر فوقیت حاصل ہو۔ بلکہ معاش کا حصول معاد کے لیے ہو اور معاش فردی، معاشرتی و ریاسی سطح پر معاد سے مرتبط ہو۔
- ظلم سے اجتناب کیا جائے اور عدل و احسان کو اختیار کیا جائے۔

۲۔ تجارت و مالیات (تمویل) کے اصول

امام غزالیؒ کے نزدیک تجارت اور مالی معاملات میں مندرجہ ذیل اصولوں پر عمل ضروری ہے:

- بیع کے شرعی اصولوں پر کاربند رہنا: لین دین کے تمام معاملات میں شفافیت اور دیانت داری کو یقینی بنایا جائے۔
- شراکت کے ضابطوں کی پاس داری: کاروباری شراکت میں منصفانہ معاہدات اور

شفاف حسابات کا خیال رکھا جائے۔

- قرض کے لین دین میں احسان: قرض دیتے اور لیتے وقت سختی یا استحصال کے بجائے نرمی اور احسان کا جذبہ رکھا جائے تاکہ معاشرے میں باہمی تعاون اور ہمدردی فروغ پائے۔

امام غزالیؒ کے نزدیک یہ اصول زمان و مکان کی قید سے بالاتر ہیں، لہٰذا آج کے دور میں بھی ان پر عمل ممکن ہے۔

۳۔ امام غزالی کا دور اور موجودہ تناظر

امام غزالی کا دور تین افضل ترین قرون میں سے تو نہ تھا لیکن اس سے بہت زیادہ دور بھی نہ تھا (آپ کی ولادت باسعادت پانچویں صدی کے وسط میں ہوئی اور آپ نے اپنی حیات پر برکت کا زیادہ تر حصہ اسی صدی میں گزارا)۔ اس دور میں ایک مضبوط اسلامی ریاست قائم تھی اور اسلامی قوانین کا نفاذ موجود تھا۔ اس کے باوجود امام غزالیؒ مالی معاملات کی اصلاح اور ان کی تبلیغ پر زور دیتے تھے تاکہ معاشرے میں فرد اور اجتماع کی سطح پر صحیح مالیاتی رویّوں کو فروغ دیا جاسکے۔ یہی اصول آج کے دور میں بھی رہنمائی فراہم کرسکتے ہیں، اگرچہ آج کے دور میں ریاستی سطح پر وہ سہولتیں یا قوانین میسر نہیں ہیں، تاہم افراد اور تنظیمیں باہمی تعاون سے یہ کام سرانجام دے سکتی ہیں۔

۴۔ عصرِ حاضر میں عملی اقدامات

امام غزالیؒ کی تعلیمات کی روشنی میں موجودہ دور میں درج ذیل اقدامات کیے جاسکتے ہیں:

- بازاروں میں تبلیغ اور تربیت: اسلامی جماعتیں اور اصلاحی تنظیمیں تاجروں، دکان داروں اور چھوٹے کاروباری حضرات کی تربیت کریں۔ صحابہ کرامؓ اور بزرگانِ دین کی طرح بازاروں میں گشت کیا جائے اور حلال رزق کے اصول سکھائے جائیں۔ امام غزالی نے لکھا ہے کہ جب انسان کسب و معاش کے میدان میں آتا

ہے تو اس پر کسب و معاش سے متعلقہ فقہی احکام (احکام ظاہرہ و باطنہ) اور متعلقہ اسلامی تعلیمات کا علم حاصل کرنا فرض عین ہو جاتا ہے۔

- حسبت یا محتسب کا ادارہ قائم کرنا: اسلامی جماعتوں میں ایک حسبت (محتسب) کا نظام تشکیل دیا جائے جو بازاروں کی نگرانی کرے۔ اسلامی اصولوں کے مطابق لین دین اور کاروبار کو فروغ دینے کے لیے عملی رہنمائی فراہم کرے۔
- تربیت یافتہ تاجروں کو سرٹیفکیٹ: جو دکان دار یا تاجر اسلامی کاروباری اصولوں کو سیکھیں اور ان کی پاس داری کریں، انہیں ایک تصدیقی سرٹیفکیٹ جاری کیا جائے۔ عوام الناس کو ترغیب دی جائے کہ وہ انہی تربیت یافتہ اور تصدیق شدہ تاجروں سے خرید و فروخت کریں۔
- شراکت کے فروغ کے لیے ادارے قائم کرنا: بعض دینی ادارے اور علما محدود پیمانے پر شریعت کے مطابق شراکت کے معاہدات کروا رہے ہیں۔ اس کام کو منظم کرنے کے لیے شراکت بورڈ بنائے جائیں جہاں ہر کاروبار کو اسلامی اصولوں کے مطابق چلانے کی تربیت دی جائے اور اس کے مطابق آڈٹ رپورٹ جاری کی جائے۔ عام مسلمانوں کو بھی شراکتی کاروباروں میں فنڈ اکٹھا کرنے اور شراکت داروں کا انتظام کرنے میں معاونت فراہم کی جائے۔
- اسلامی اکاؤنٹنگ اسٹینڈرڈ کا اجرا: ایک مربوط نظام کے تحت اسلامی معیارات پر کاروباروں کی جانچ پڑتال کی جائے۔ یہ نظام مختلف سرکلز اور ماہرین کے تعاون سے ترتیب دیا جائے، تاکہ حلال و حرام کی تفریق کو واضح کیا جا سکے۔
- غیر سرکاری اور معاشرتی تعاون: یہ تمام اقدامات حکومتی جبر کے بغیر، باہمی تعاون اور سماجی اصلاح کی نیت سے کیے جائیں۔ تبلیغی جماعتیں اور دیگر اصلاحی یا سیاسی تنظیمیں معاشرے میں اسلامی اصولوں کی آگاہی اور ان کے عملی نفاذ کی تحریک چلا سکتی ہیں۔

خلاصہ

امام غزالیؒ نے کسبِ معاش کو ایک اہم دینی فریضہ قرار دیا ہے، جس کی بنیاد حلال کمائی، آخرت کو ترجیح دینے اور عدل و احسان پر رکھی گئی ہے۔ یہ اصول ہر دور میں قابلِ عمل ہیں۔ آج کے دور میں بھی، اگرچہ اسلامی ریاست کا وہ ڈھانچہ موجود نہیں، لیکن باہمی تعاون، تنظیم سازی، اور تربیت و تبلیغ کے ذریعے حلال معاشی نظام کی بنیادیں استوار کی جاسکتی ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ انفرادی اور اجتماعی سطح پر ان اصولوں کو سمجھا جائے اور ان پر عمل درآمد کے لیے ٹھوس عملی اقدامات کیے جائیں۔

اس دور کا سب سے بڑا چیلنج

درج بالا طریقہ کار کو ہم نے زمان و مکاں کی قید سے آزاد ایک قابل عمل طریقۂ احیاءِ اسلامی مالیات کے پیرائے میں بیان کیا۔ مگر آج کے دور کے معاملے کی سنگینی یہ ہے کہ ایک کفریہ نظام نے پورے عالم کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ اس نظام کا سرچشمہ مالیاتی ادارے ہیں جو سود، سٹہ، غرر اور ارتکازِ سرمایہ کی بنیاد پر اس نظام کو منظم کیے ہوئے ہیں۔ آج کے دور میں سرمایہ دارانہ مالیاتی اداروں میں شرکت کے بغیر کسب معاش مشکل اور کئی صورتوں میں ناممکن نظر آتا ہے۔

امام غزالی کا دور بھی آج کے دور کی طرح فکری چیلنجز پیش کر رہا تھا۔ ایک طرف یونانی فکر کی یلغار تھی، جس نے اس دور میں فتنہ کی صورت اختیار کرلی تھی۔ امام صاحب نے اپنے دور کے علمی و فلسفیانہ تنازعات، سیاسی عدم استحکام اور اخلاقی چیلنجز کا مقابلہ کرتے ہوئے اسلامی فکر کو دوبارہ زندہ کیا۔ ان کی کوشش تھی کہ علم صرف کتابی مطالعہ نہ ہو بلکہ دل کی صفائی اور روحانی تجدید کے ذریعے ایک مکمل، ہمہ گیر معرفت کا ذریعہ بنے۔ یہ تمام پہلو آج بھی اسلامی فکر اور جدید معاشرتی مسائل کے حل کے لیے ایک قیمتی درس کے طور پر دیکھے جاتے ہیں۔ اس عمومی مماثلت کے باوجود اہم فرق یہ ہے کہ امام کے دور میں اسلامی ریاست اور شریعت کی

بالادستی قائم تھی۔ اس زمانے میں عباسی خلافت بغداد میں قائم تھی، مگر اس کی سیاسی طاقت میں نمایاں کمی واقع ہو چکی تھی۔ حقیقی سیاسی کنٹرول سلجوقی بادشاہوں کے پاس تھا جنہوں نے اسلامی دنیا کو منظم رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس دور میں ایک منظم نظام اسلامی قائم تھا، علاوہ ازیں کوئی اور منظم نظام اسکو چیلنج نہیں کر رہا تھا۔ اصلاحی تحریکات کی ضرورت تھی اور کچھ فکری اور علمی کمزوریوں کو دور کرکے امام صاحب نے ان تہذیبی اور فکری چیلنجز کو شکست سے دوچار کر دیا۔ مگر ہمارا دور جدید ان معنوں میں مختلف ہے کہ آج ایک کفریہ نظام ہمارے اوپر مسلط ہے۔ اب صرف اصلاح سے کام نہیں بنے گا بلکہ انقلابی حکمت عملی کے تحت اس نظام کفر کی جگہ اسلامی نظام کو منظم کرنا ہو گا۔ کفریہ نظام کی جڑیں مالیاتی نظام سے پیوستہ ہیں اگر کفریہ نظام مالیات کو کمزور کرکے اس جگہ اسلامی تمویلی اداروں کی صف بندی کر دی جائے تو ہم نظام کفر کو مسلمان ممالک میں شکست سے دوچار کر سکتے ہیں۔

مالیاتی نظام کا سرخیل اس کا کرنسی کا نظام ہوتا ہے، نبی اکرم ﷺ کے دور سے لے کر انیسویں صدی تک کرنسی کی حثیت اور مقصد کم و بیش ایک ہی تھا، دھاتی کرنسی ہر جگہ رائج تھی جو کہ ایک آلۂ تبادلہ تھی۔ آپ ﷺ کے دور میں قبل از اسلام کے رومی اور فارسی سکّے رائج رہے۔ مگر آج کے دور میں سب سے بڑا چیلنج ہی اس کرنسی کا ہے جو اپنی حیثیت ہی بدل چکی ہے اور ایک اعتباری، کاغذی کرنسی میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اس نئی کرنسی کی اپنی حقیقی قیمت ردّی کے برابر بھی نہیں ہے کہ اس کے پیچھے سودی قرضے ہیں جو حکومت اپنے اعتبار اور قوت کی بنیاد پر جاری کرتی ہے۔ یہ کرنسی آلۂ تبادلہ سے زیادہ ایک شے بن کر سود پر خریدی اور بیچی جاتی ہے۔ اس کے لیے مالیاتی اداروں نے ایک نئی ادارتی صف بندی کر لی ہے جو پہلے کبھی تاریخ میں موجود نہ تھی۔ یہ صف بندی زر اور سرمائے کی مارکیٹ پر مشتمل ہے۔ زر کی مارکیٹ میں قرضوں کی لین دین کی بنیاد پر زر کی ترسیل اور اس کی خرید و فروخت ہوتی ہے، جس کی قدر سود سے متعین کی جاتی ہے۔ جس ادارے میں غرر اور سٹے کی بنیاد پر تجارت کو فروغ دیا جاتا ہے اس کو سرمائے کی مارکیٹ کہتے ہیں۔ اس مارکیٹ میں تجارتی

ادارے شخصی ملکیت کو ترک کر کے ملکیت کو سرمائے کے سپرد کر دیتے ہیں۔

اس دور میں یہ نظام مالیات کیسے کام کرتا ہے اس کے پیچھے کیا افکار ہیں ان کا جاننا ہر مسلمان تاجر اور علمائے کرام پر فرض ہے۔ جیسا کہ حدیث نبوی ﷺ ہے:

طلب العلمِ فریضةٌ علی کُلّ مسلم۔۔۔۔۔ الخ (علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔۔۔۔)[1]

امام غزالی فرماتے ہیں کہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر علم کا جاننا ضروری ہے بلکہ جس علم کی فرد و جماعت مسلمین کو ضرورت ہو اس کا سیکھنا فرض ہو جاتا ہے۔

مالیات کے قائم سرمایہ دارانہ نظام کی حقیقت اور اس کے پیچھے کار فرما علمیت کو جاننا اس دور کی اہم ضرورت ہے۔ تجارت کے مسئلے میں مباح اور غیر مباح کا جاننا بے حد ضروری ہے۔ حضرت عمر کے بارے میں روایت ہے کہ وہ اپنے دورِ خلافت میں بازار کا گشت لگاتے تھے اور بعض جاہل تاجروں کو درّے لگایا کرتے تھے کہ ان کو تجارت کے شرعی احکام کا علم نہیں ہوتا تھا۔

- اس دور کا سب سے بڑا چیلنج امام غزالی کی طرز پر موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کا گہرا علم حاصل کرنا اور اس کا تہافت یعنی نقد مرتب کرنا ہے۔ جس طرح اپنے زمانے کے فتنے یعنی فلسفۂ یونان کا ہمارے امام نے گہرا مطالعہ کیا اور اس کا اسلامی نقد مرتب کیا تھا اسی طرح آج موجودہ سرمایہ دارنہ مالیاتی نظام کے فتنے کو اس کی اصل علمیت کی بنیاد پر سمجھنا اور اس کی تنقید مرتب کرنا ہمارا اجتماعی فرض ہے۔
- اس کے بعد اس نظام کو شکست دینے کی عملی حکمت عملی کو وضع کرنا ضروری ہے۔

[1] فقد اختلف علماء الحديث في صحة هذا الحديث –كما في فيض القدير للمناوي– والراجح من أقوالهم أنه صحيح لغيره، كما قال السيوطي رحمه الله تعالى ولفظه: "طلب العلم فريضة على كل مسلم" بدون لفظة "ومسلمة" ولا يعني هذا أن المسلمة لا يجب عليها التعلم، بل هي داخلة في لفظ مسلم، لأنه إذا أطلق شمل الذكر والأنثى. (نقلا عن موقع اسلام ويب).

- عملی کام کے ضمن میں ان اداروں کی تشکیل کو ممکن بنانا اہم ہے جن میں سود اور سٹے کا شائبہ تک بھی نہ ہو۔
- سودی اور سٹے سے منسلک اعتباری کرنسی کی جگہ اسلامی کمیونٹی کرنسی کا اجرا کرنا بھی اس کام کا ایک اہم حصہ ہے۔
- اس کے علاوہ دیگر امور کا جائزہ لینے کے لیے علمائے کرام اور مخلص دین کی ایک انقلابی شوریٰ کا قیام عمل میں لانے کی ضرورت ہے جو کہ علمی اور عملی مالیاتی امور کی نگرانی بھی کرے اور اسلامی مالی حکمت عملی کی تنفیذ کو ممکن بھی بنائے (یہ شوریٰ حکومتی مداخلت سے آزاد ہونی چاہیے جس میں اسلامی بینکاری کے شریعہ ایڈوائزر شامل نہ ہوں)۔
- شریعہ ایڈوائیزر آج کے دور میں معتزلہ کی فکر کے پیروکار ہیں نہ کہ امام غزالی کے فکر سے ہم آہنگ۔ یہ حضرات اسلامی فکر کو جدید سرمایہ دارانہ فکر سے ہم آہنگ کرنے کے لیے اسلامی بینکاری کی ادارتی صف بندی کر رہے ہیں۔ سود، سٹے اور غرر کا اسلامی جواز پیش کر رہے ہیں اور اس کے لیے بیع کے حیلے اور آلات جس میں یکساں ریٹ ہو استعمال کرتے ہیں، جس کی شرح ہر ملک کے بینکوں کے مابین سود کی شرح سے اخذ کی جاتی ہے۔

اس دور کے نظام نے مال کی ہوس اور حرص و حسد کے جذبے کو تقویت دے کر مالیات کی مارکیٹ کے ذریعے مال سے مال بنانا ممکن کر دیا ہے۔ یہ مارکیٹ دراصل افراد اور معاشرے میں ان جذبات کو مہمیز دیتی ہیں جس کے نتیجے میں زیادہ سے زیادہ افراد حریص و حاسد بنتے جا رہے ہیں۔ اس لیے ان کا مقابلہ کرنے کے لیے ایسے متبادل اسلامی اداروں کا قیام عمل میں لانا ضروری ہے جہاں پر پورا کنٹرول علمائے کرام اور صوفیائے عظام کے پاس ہو تاکہ مالیاتی اداروں کو فروغِ اخلاق اسلامی، صبر، توکل، قناعت، زہد و جہاد کے لیے استعمال کیا جائے نہ کہ شیطان کے پجاری بن کر سرمایہ دارانہ مالیاتی اداروں کے زیر اثر حرص و حسد کے جذبات کو فروغ دیا جائے۔ اسی لیے یہ کام ایک فرض کفایہ ہے جسے کسی ایک اسلامی گروہ کو تو کم از کم ادا کرنا چاہیے ورنہ ہر مسلمان گناہ گار ہو گا۔

کیا جماعت اسلامی ایک انقلابی جماعت ہے؟

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

میں اس مضمون میں یہ سوال اٹھاؤں گا کہ کیا جماعت اسلامی کو ایک انقلابی اسلامی جماعت کہا جاسکتا ہے اور اگر ایسا ہے تو کن معنوں میں؟ مضمون کے چار حصے ہیں۔ پہلے انقلاب کے تصور پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی۔ پھر مولانا مودودیؒ کے تصورِ انقلاب کی تصویر کشی کی جائے گی۔ اس کے بعد جماعت اسلامی پاکستان کی ۷۷ سالہ جدوجہد کا نقد مرتب کیا جائے گا اور آخر میں جماعت میں انقلابیت کو فروغ دینے کے لیے چند تجاویز مرتب کی جائیں گی۔

انقلاب کیا ہے؟

انقلاب کا عمل اور نظریہ سرمایہ دارانہ دور کی پیداوار ہے۔ انقلابی عمل سے مراد یہ ہے کہ ایک مخصوص اقلیتی نظریاتی گروہ ریاستی اقتدار کے حصول کی جدوجہد کرتا ہے اور اگر ریاست پر قبضہ حاصل ہو گیا تو پھر اپنے نظریہ اور اس سے متعلقہ نظام حیات کو ریاست کی قوت کے ذریعہ معاشرہ میں رائج کرتا ہے۔

اس قسم کا عمل پہلے برطانیہ پھر امریکا، فرانس، روس اور چین میں رونما ہوا اور ہر جگہ سرمایہ دارانہ طرزِ حیات اور نظام زندگی کو ایک نظریاتی اقلیتی قیادت نے معاشرہ پر مسلط کر دیا۔ یہ تمام سرمایہ دارانہ انقلاب تھے اور ان کے نتیجہ میں سرمایہ دارانہ نظریات (لبرل ازم، قوم پرستی اور اشتراکیت) ہی غالب آئے۔ ان نظریات کی باہمی کشمکش بھی انقلابی شکل اختیار کر سکتی ہے۔ مثلاً بیسویں صدی کے آخر میں سوویت یونین میں ایک لبرل انقلاب رونما ہوا جس نے اشتراکی سرمایہ داری کو معطل کر کے سوویت یونین کو روس میں تبدیل کر دیا۔

انقلاب تہذیب اسلامی کے لیے ایک اجنبی تصور ہے۔ مسلم دنیا پر استعماری غلبہ سے قبل اسلامی ریاستیں ہی قائم رہیں۔ کسی اسلامی نظریاتی گروہ کو انقلابی جدوجہد برپا کرنے کی

ضرورت کا احساس نہ ہوا کیونکہ خلافت عثمانیہ اور سلطنت صفویہ کے سقوط تک ریاستی فیصلے شرع مطہرہ اور علوم اسلامیہ کے تناظر میں ہی مرتب کیے جاتے رہے اور اسلامی طرزِ حیات اور نظام زندگی محفوظ اور مامون رہا۔

استعماری غلبہ نے حالات کو یکسر بدل دیا۔ استعماری قوتوں نے اسلام کا ریاستی نظام یکسر معطل کر دیا اور ریاستی اقتدار کفار کے ہاتھوں میں منتقل ہو گیا۔ مسلمانوں کے نظریاتی گروہ بالخصوص علمائے کرام اور صوفیائے عظام (انیسویں صدی کی جہادی تحریکوں کی پسپائی کے بعد) ریاستی اقتدار سے محرومی پر مجبور بھی ہو گئے اور راضی بھی۔ انہوں نے پورا زور اسلامی معاشرت و انفرادیت کی حفاظت پر لگا دیا اور جمہوری عمل سے مصالحت کو اسلامی معاشرت کے فروغ اور تحفظ کے لیے ضروری تصور کیا۔

ریاستی اقتدار سے محرومی کو قبول کرنے کا یہ عمل آزاد مسلم ممالک کے قیام کے بعد بھی جاری ہے۔ یہ ریاستیں خالصتاً دہریہ (سیکولر) ریاستیں تھیں جن کا نظام کار اور دساتیر سرمایہ دارانہ جمہوری اور استبدادی خطوط پر مرتب کیے گئے اور جن کے حکام استعمار کے غلام اور اس کے نظریاتی خوشہ چین تھے۔ اسلامی نظریاتی گروہوں کے سواد اعظم نے ریاستی اقتداری محرومی قبول کر لی اور قائم کی گئی دہریہ ریاستوں کو ان اسلامی ریاستوں کا تسلسل تصور کیا جو استعماری غلبہ کے دور سے قبل مسلم دنیا میں قائم تھیں۔

ریاستی اقتداری قوت سے محروم ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی معاشرت اور علمیت کا دائرہ مستقل سکڑتا رہا اور ریاستی نظام کی طرح ہمارا معاشرتی نظام بھی سرمایہ دارانہ نظم زندگی میں جذب ہوتا چلا گیا۔ جذب ہونے کا یہ عمل سیاست اور معیشت تک محدود نہ رہا بلکہ ثقافت اور انفرادیت کو بھی اپنے گھیرے میں لیتا چلا گیا اور اسلامی طرزِ زندگی کی سرمایہ کاری انہی خطوط پر ہونے لگی جن خطوط پر عیسائیت کی سرمایہ کاری سترھویں صدی سے آج تک ہو رہی ہے۔

ریاستی اقتدار سے محرومی کے نقصانات کا احساس سب سے پہلے ایرانی علما کو ہوا جنہوں نے ۱۹۰۶ء کے انقلاب سفید کی ناکامی کے بعد سے حصولِ اقتدار کی جدوجہد شروع کر دی (جو ۷۲

سال بعد کامیاب ہوئی)۔ انقلابی عمل کی پہلی شرعی توجیہ امام خمینی رحمہ اللہ کے معرکۃ الآرا مقالہ "ولایت فقیہ" میں ملتی ہے۔ آپ کا موقف یہ ہے کہ امام مہدی علیہ السلام کی غیر موجودگی میں یہ فقہا کی ذمہ داری ہے کہ وہ ریاستی اقتدار سنبھالیں تاکہ شرع نافذ ہو اور اجتماعی فیصلے علوم اسلامیہ کے تناظر میں کیے جاسکیں اور اگر فقہاء اپنی اس ذمہ داری کو قبول کرنے سے انکار کر دیں تو وہ فرض کفایہ ادا نہیں کر رہے جس کی ادائیگی کی ذمہ داری انہی پر لاگو ہوتی ہے۔

ولایت فقیہ یا حکومت اسلامی فقہ انقلاب اسلامی کی بنیادی کتاب ہے۔ یہ کتاب اس بات کا شرعی جواز مرتب کرتی ہے کہ انقلابی عمل سرمایہ دارانہ نظاماتی عمل کی تسخیر کا ذریعہ ہے۔ اس رسالہ میں امام یہ بھی فرماتے ہیں کہ انقلابی عمل کافرانہ نظام کو مسخر کرنے کا واحد طریقہ نہیں بلکہ اس کا گہرا تعلق اصلاحی عمل سے بھی ہے بلکہ انقلابی عمل دراصل اصلاحی عمل کو موثر بنانے کے لیے ضروری ہے۔

مولانا مودودی کی فکر میں تصورِ انقلاب

مولانا مودودیؒ امام خمینیؒ کی اس رائے سے متفق ہیں۔ دورِ حاضر (یعنی سرمایہ داری کے نظاماتی تغلب کے دور) میں ریاستی اقتدار سے محرومی اقامت دین کی ادائیگی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ مولانا مودودی کے اس دعوے کو بیش تر علماء بالخصوص دیوبندی علماء نے دین کی سیاسی تعبیر قرار دیا جو درست نہیں۔ مولانا اقامت دین کے دوسرے پہلوؤں سے انکار نہیں کرتے بلکہ چونکہ آپ انیسویں صدی کے علمائے جہاد (حضرت مہاجر مکی، حضرت اسیر مالٹا اور صادق پوری سیدوں رحمہم اللہ اجمعین) کے وارث اور جانشین ہیں لہٰذا سیاسی جہادی کشمکش کو دورِ حاضر میں جاری رکھنے پر زور دیتے ہیں۔ آپ کی رائے میں دورِ حاضر میں اقامت دین (تحفظ دین اور غلبہ دین) کے فرائض کی ادائیگی کے لیے نظاماتی سیاسی جدوجہد کا جاری رہنا لازمی ہے۔

آپ کی یہ رائے آپ کے دو کلیدی اجتہادات (اسلام ایک مکمل خود کفیل نظام حیات ہے اور

مغرب جاہلیت خالصہ ہے) سے مربوط ہے۔ آپ ان معنوں میں ایک انقلابی ہیں کہ غلبۂ دین کو ریاستی اقتدار کے حصول پر منحصر تصور کرتے ہیں۔ آپ کی رائے میں ریاستی اقتدار کے حصول کے بغیر اسلام کو بحیثیت ایک خود کفیل اور مکمل نظام زندگی نافذ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ جاہلیت خالصہ (مغرب) کی اصل قوت نافذہ ریاستی ہی ہے۔

چونکہ علمائے دیوبند نے ریاستی اقتدار کے حصول کی کشمکش سے اصولاً پہلو تہی فرمائی تھی (تحریک ریشمی رومال، مولانا محمود الحسن کی جدوجہد اور صادق پوری سیدوں کی کوششوں کا نہ دیوبندیوں نے ساتھ دیا نہ بریلی نے) لہٰذا مولانا علماء سے جہادی قیادت فراہم کرنے کی امید وابستہ نہیں کرتے بلکہ ریاستی حصولِ اقتدار منظم کرنے کے لئے آپ نے جماعتِ اسلامی بنائی اور غیر علماء سے جہادی قیادت فراہم کرنے کی امید وابستہ رکھی۔

پھر ۱۹۴۹ء میں قرار دادِ مقاصد کی منظوری کے بعد آپ نے پاکستان کو ایک (دہریہ نہیں) اسلامی ریاست کے طور پر تسلیم کر لیا اور جماعت کی ریاستی اقتدار کی جدوجہد کو جمہوری دستوری قالب میں ڈھال دیا۔ آپ نے سرمایہ دارانہ ریاست کی ہیئتی تنظیمی نوعیت سے سہو نظر فرمایا اور حکومت اور ریاست کے اجزائے ترکیبی میں فرق کو ملحوظ خاطر نہ رکھا۔ حکومت کی تبدیلی جو جمہوری عمل سے ممکن ہے ریاستی نظاماتی تغیر کے ہم معنی نہیں ہوتی۔ سرمایہ دارانہ ریاست کے دیگر تحکمی اجزاء (کارپوریشن، میڈیا، فوج، انتظامیہ، عدلیہ) جمہوری عمل کی گرفت سے نسبتاً آزاد ہوتے ہیں اور ان کی تسخیر کی کوئی قابلِ عمل تجویز مولانا نے مرتب نہیں فرمائی یعنی جمہوری عمل کے ذریعہ سرمایہ دارانہ نظاماتی اقتدار کے انہدام کا کوئی تصور پیش نہیں کیا گیا۔

پھر آپ ۳۲ سال تک اس غلط مفروضے کے قائل رہے کہ پاکستانی عوام کی غالب اکثریت اسلامی نظام کے قیام کی خواہاں ہے جبکہ حقیقتاً کبھی بھی غلبۂ دین کے حامیان کی تعداد ملک میں ۹ یا ۱۰ فیصد سے زیادہ نہیں رہی۔ اس گمان نے انہیں جمہوری عمل کو اقامت دین کا طریقہ تصور کرنے پر آمادہ کیا اور انہوں نے ساری عمر جمہوری دستوری جدوجہد کی۔

پاکستان کے معروضی حالات میں جمہوری عمل میں شرکت نہ صرف ضروری بلکہ ناگزیر ہے۔ لیکن جمہوری عمل کو انقلاب اسلامی کا ذریعہ بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کو خود اپنی تسخیر کے لئے استعمال کیا جائے۔ اس کو negation of the negation کہتے ہیں۔ یعنی جمہوری عمل کا ایسا استعمال کیا جائے کہ سرمایہ دارانہ مقتدرہ کی ریاستی (صرف حکومتی نہیں) گرفت کمزور ہوتی جائے اور ریاستی قوت بتدریج اسلامی انقلابیوں اور ان کے حامیوں کی طرف منتقل ہوتی جائے۔ اسلامی انقلابی سرمایہ دارانہ نظام اور اس کے دستوری جمہوری اظہار کی اصلاح کی نہیں اس کے انہدام کی جدوجہد کرتے ہیں۔ یہ جدوجہد لازماً معاشرتی سطح پر غیر جمہوری بنیادوں پر ایک متبادل نظام اقتدار کو مرتب کرنے پر منحصر ہوتی ہے۔ اس عمل کے نتیجہ میں معاشرتی سطح پر بتدریج ایک ریاستی نظام (state within state) قائم کیا جاتا ہے جو سرمایہ دارانہ ریاستی عملداری کو معطل کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔

مولانا مودودی کی فکر کی ایک بنیادی کمزوری یہ ہے کہ ان کی فکر میں معاشرہ کا (خواہ اسلامی خواہ سرمایہ دارانہ) کوئی تصور موجود نہیں۔ آپ صوفیائے کرام کی معاشرتی جدوجہد کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتے اور معاشرہ میں رائج اسلامی رسوم و رواج کو ہندو مت اور بدھ مت کا پرتو تصور فرماتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ سرمایہ دارانہ معاشرت اور ریاست کے باہمی ارتباط کو نظر انداز فرماتے ہوئے سرمایہ دارانہ ریاستی اداروں نوکر شاہی، عدلیہ، مقننہ، کارپوریشن، میڈیا وغیرہ کی معاشرتی پیوستگی کا ادراک نہیں رکھتے اور انہیں غیر اقداری (value neutral) تصور کرتے ہیں۔ لہٰذا مولانا مودودی کا سیاسی عمل ہمیشہ (انقلابی نہیں بلکہ) اصلاحی رہا۔ آپ اسلام کو ایک مکمل خود کفیل نظام زندگی تصور کرتے ہیں لیکن اسلامی نظام زندگی پر سرمایہ دارانہ ریاستی اور معاشرتی تغلب کو رفع کرنے کی کوئی تجویز آپ کی فکر میں نہیں ملتی۔

جماعت اسلامی کی پالیسی

مولانا مودودی جماعت کے راہبر و فکری رہنما ہیں۔ کسی اور عالم کو جماعت نے قبول نہیں کیا۔ جماعت اسلامی اصولاً ایک اسلامی انقلابی جماعت ہے کیونکہ وہ مولانا کے تین بنیادی اجتہادات:

- اس دور میں غلبۂ دین کے لیے ریاستی عمل کی تقدیم فرض کفایہ ہے؛
- اسلام ایک مکمل اور خود کفیل نظام حیات ہے؛
- مغرب جاہلیت خالصہ ہے۔

کو قبول کرتی ہے۔ ہم ابھی تک کسی دوسری جماعت کو ان تین بنیادی اجتہادات کو قبول کرنے پر آمادہ نہ کر سکے۔ لہٰذا جماعت اسلامی مولانا مودودی کی واحد وارث جماعت ہے۔ یہ بات ان بزرگوں اور جماعتوں (تنظیم اسلامی اور تحریک اسلامی) کے بارے میں بھی درست ہے جو جماعت سے نکلے ہیں کیونکہ انہوں نے بھی ریاستی عمل کی تقدیم کو اصولاً رد کر دیا ہے۔ یہ جماعتیں اور بزرگ بھی اصولاً انقلابی نہیں۔

جماعت اسلامی پاکستان کی واحد اسلامی انقلابی جماعت ہے لیکن یہ بات صرف اصولاً درست ہے عملاً درست نہیں۔ عملاً جماعت اسلامی ایک سرمایہ دارانہ سوشل ڈیموکریٹک پارٹی بنتی جا رہی ہے۔ یہ بات اس کے ریاستی عمل سے بھی واضح ہے اور اس کے معاشرتی تعامل سے بھی۔

ریاستی جدوجہد خالصتاً روایتی جمہوری خطوط پر مروج ہے۔ جماعت نے حقوق کی سیاست کی ہے اور گاہے گاہے اس ضمن میں دھرنا یہ جماعتوں سے اشتراک عمل بھی کیا۔ اس نے ہر قومی انتخاب میں حصہ لیا اور ہر مرتبہ جو انتخابی منشور مرتب کیا وہ قوم پرست اور سوشل ڈیموکریٹ وعدوں اور دعووں سے بھرا پڑا تھا۔ اس نے جو حکومتیں بنائیں (۱۹۷۸ء میں ضیاء الحق مرحوم کی سربراہی میں اور ۲۰۰۲ تا ۲۰۰۷ خیبر پختون خوا میں) وہ خالص سرمایہ دارانہ

خطوط پر منظم تھیں۔ اس نے اپنی پیہم انتخابی ناکامیوں سے کوئی سبق نہیں سیکھا اور انتخابی عمل کو انقلابی خطوط پر مرتب کرنے کا تصور اس کے لئے ہمیشہ اجنبی رہا۔ وہ ہر انتخاب میں اپنے آپ کو سرمایہ داری کے بہترین مخلص خادم کے طور پر پیش کرتی رہی۔

معاشرتی سطح پر بھی جماعت کی پالیسی غیر انقلابی رہی۔ اس نے مولانا مودودی کی فکر کو برصغیر کی اسلامی فکر کے مرکزی دھارے (mainstream) میں سمونے کی کوشش نہ کی اور مولانا مودودی کی فکر اور آپ کے کم از کم دو بنیادی اجتہادات (دور حاضر میں ریاستی عمل کی تقدیم اور مغرب جاہلیت خالصہ ہے) برصغیر کے علماء اور صوفیا کے حلقوں میں اجنبی ہی رہے۔ قاضی حسین احمد کے مبارک دور کے علاوہ کبھی بھی علمائے کرام سے مستحکم روابط مرتب نہ کئے جاسکے۔ مولانا مودودی کی فکر کو برصغیر کے مرکزی اسلامی دھارے میں سمونا کوئی دشوار گذار کام نہیں کیونکہ مولانا ایک ایسے راسخ العقیدہ متکلم اسلام ہیں جن کی اساسی فکر جمہور علماء کے اعتقادات سے سرمو اختلاف نہیں کرتی۔

جماعت کی معاشرتی اجنبیت کی بنیادی وجہ اس کی فکر کا تدریجی تجدد یعنی ماڈرنائزیشن ہے۔ ماڈرنائزیشن کا یہ عمل ۱۹۵۷ کے بعد شروع ہوا جب کئی جید علماء جماعت چھوڑ گئے اور انہوں نے پروفیسر خورشید اور خرم جاہ مراد جیسے جدیدیت خواہ یعنی ماڈرنسٹ دانش وروں کو قیادت میں آنے کا موقع فراہم کیا۔ یہ دانشور سعودی عرب کے مراعات یافتہ خوشہ چین ہیں نیز عملاً اور نظریاتی طور پر "مغرب جاہلیت خالصہ ہے" کے اجتہاد کو رد کرتے ہیں۔

علماء اور صوفیا سے اجنبیت جماعت کی معاشرتی اجنبیت کا بنیادی سبب ہے۔ کیونکہ مسلم عوام کی فطری قیادت علماء اور صوفیا ہی فراہم کرتے ہیں۔ اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ میں کسی ایک ایسی انقلابی جدوجہد کی نشان دہی نہیں کی جاسکتی جس کی قیادت علماء اور صوفیا نے نہ فرمائی ہو۔ اس لیے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "علماء انبیا کے وارث ہیں"۔

امارت بلقیس ان ہی کو ملنی چاہیے پہلے
امیر المؤمنین ان میں سے چن کر لائے پہلے

علمائے کرام کی قیادت میں مسلم عوام کو ایسے منظم کرنا کہ تحکمی قوت ریاستی اداروں (مقننہ، انتظامیہ، عدلیہ، کارپوریشن، میڈیا) سے منتقل ہو کر علماء کے ہاتھوں میں مرتکز ہوتی چلی جائے، اسلامی انقلاب کا بنیادی عمل ہے۔ اس عمل کو جمہوری عمل سے پیوست کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ علمائے ایران نے کر کے دکھادیا ہے۔ جماعت کو اس بنیادی کام کو کرنے کا بالکل شعور نہیں کیونکہ وہ اصولاً اسلامی انقلابی جماعت ہونے کا دعویٰ کرنے کے باوجود عملاً ایک سرمایہ دارانہ اسلامی جماعت بنتی جا رہی ہے اور اپنی پیہم انتخابی اور احتجاجی شکستوں کے باوجود جمہوری عمل کے ذریعے سرمایہ دارانہ اقتدار میں شرکت کی کوشش کو جاری رکھے ہوئے ہے۔

جماعت کو سرمایانے (سرمایہ دارانے) کی یہ مہم موجودہ امیر جماعت نعیم الرحمان کی قیادت میں زور پکڑ گئی ہے۔ اب جماعت اسلامی کی قیادت انقلابی ہونے کے دعوے سے بھی گریز کرتی نظر آتی ہے اور اس کا پورا زور عوام کے سرمایہ دارانہ حقوق کی فراہمی پر ہے۔ لیکن وہ سرمایہ دارانہ عدل کی جس تشریح کو پیش کرتی ہے وہ پاکستانی ریاست کی سامراجی انضمامی ضرورت کو ملحوظ خاطر رکھ کر مرتب کی گئی ہے۔ لہٰذا جہاد فلسطین کی لفظی کلامی حمایت میں تو پیش پیش ہے لیکن امریکی پاکستانی معاشی اور تجارتی تعلقات کے منقطع کرنے کا مطالبہ نہیں کرتی۔ وہ قیمتوں اور بے روزگاری پر احتجاج کرتی ہے لیکن آئی ایم ایف کے حالیہ ای ای ایف پروگرام کی منسوخی اور بیرونی سودی قرضوں کی ادائیگی سے انکار کی طالب نہیں۔ وہ "حق دو کراچی کو" اور "بنو قابل" کی مہمات تو چلا رہی ہے لیکن ان مہمات کو عوامی اسلامی انقلابی ادارتی صف بندی کا پیش خیمہ بنانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔

نعیم الرحمان سرمایہ دارانہ مقتدرہ کے اندر جماعت کے لیے گنجائش پیدا کرنے کی جستجو کر

رہے ہیں۔ وہ سرمایہ دارانہ مقتدرہ سے مشاورت اور افہام و تفہیم کے قائل ہیں۔ اسی بنیاد پر انہوں نے ۲۰۲۴ کی انتخابی مہم کو حکومت سے مشاورت کی بنیاد پر ختم کر دیا اور اب جب کہ واضح ہو گیا ہے کہ حکومت کے کیے گئے تمام وعدے فریب کاری پر مبنی تھے تو مصلحتاً نعیم الرحمان مزید مہمات کو موخر کیے ہوئے ہیں اور اپنی تمام تر توجہ بے ضرر "بنو قابل" مہم پر مرکوز کر رکھی ہے۔

"بنو قابل" اور "حق دو کراچی کو" جیسی مہمات سے اقامت دین کی توقع رکھنا سرمایہ دارانہ عدل کی اسلام کاری کے علاوہ کچھ نہیں۔ یہ توقع اس مفروضے پر مبنی ہے کہ سرمایہ دارانہ عدل کی فراہمی اسلامی عصبیت کے فروغ کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ جب کہ سرمایہ دارانہ عدل ظلم عظیم ہے۔ اس کی فراہمی سے تقویٰ، زہد، قناعت، صبر فروغ نہیں پاتے بلکہ حرص، حسد، شہوت اور غضب پرورش پاتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ حقوق کی وکالت اسلامی انفرادیت اور معاشرت کو تباہ کرنے کا ذریعہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نعیم الرحمان کے پبلک تخاطب سے اسلامی مطالبات تقریباً غائب ہونے لگے ہیں۔

انقلابی عمل کی ضرورت

انقلابی عمل کا جاری رہنا دور حاضر میں اقامت دین کے لیے ضروری ہے۔ ریاستی قوت کے حصول کے بغیر نہ اسلام کو بحیثیت ایک مکمل نظام زندگی کے طور پر معاشرتی سطح پر تیار کیا جا سکتا ہے نہ مغربی جاہلیت خالصہ کی عالمی بالادستی کو چیلنج کیا جا سکتا ہے۔ یہ دور ان معنوں میں مولانا مودودی کا دور ہے کہ آپ کے تین کلیدی اجتہادات کی روشنی میں اس دور میں اقامت دین کا فریضہ انجام دیا جا سکتا ہے۔

جماعت اسلامی مولانا مودودی کی فکر کی فطری اور تنہا وارث ہے۔ جماعت اصولی طور پر ایک اسلامی انقلابی جماعت ہے لیکن عملاً وہ انقلابی جماعت نہیں۔ وہ عملاً کبھی بھی انقلابی جماعت

نہیں رہی۔ اس اصولی اور عملی تضاد کی بنیادی وجہ مولانا مودودی کی فکر کی کمزوریاں ہی ہیں۔ ان کمزوریوں کو رفع کر کے اسے فکر اسلامی کے مرکزی دھارے کا جزو بنانا ہے تاکہ مولانا کے تینوں کلیدی اجتہادات پر اجماع امت قائم ہو سکے۔ یہ تمام مخلصین مصلحین دین کی، مبلغین کی، صوفیا کی، انقلابیوں کی، عابدوں کی، جماعت کی بھی، ذمہ داری ہے۔ جماعت اسلامی کو ماڈرنائزیشن سے بچا کر ایک عملی اسلامی انقلابی جماعت بنانا اس لیے ضروری ہے کہ سرمایہ دارانہ دہریت نے یہ نظریہ وضع کر لیا تو پاکستان میں اسلامی انقلاب کا چراغ گل ہو جائے گا۔ اسلامی انقلابی منتشر ہو جائیں گے اور اسلامی انقلابی معدوم ہو جائیں گے۔

دیکھو کہیں اجڑے نہ ہمارا نشیمن
اس کو لہو سے اپنے شہیدوں نے ہے سینچا
اس کو بچانا جان مصیبت میں ڈال کے
جماعت کو رکھیے میرے یارو سنبھال کے

☆☆☆

مطالباتی سیاست اور اسلامی انقلابی عمل

جاوید اکبر انصاری

مطالباتی عمل

مطالباتی سیاست جمہوری سیاست کا معمول ہے۔ جمہوریت اس نظام معاشرت اور ریاست کو کہتے ہیں جہاں عوام اور اس میں شامل ہر فرد اصولاً آزاد اور عملاً سرمایۂ عمومی کا محکوم ہوتا ہے۔ سرمایۂ عمومی (capital in general) نظم اجتماعی کو منظم اور اظہارِ انفرادیت کو متاثر کرتا ہے۔ ہر وہ عمل معقول (ریشنل) تصور کیا جاتا ہے جو سرمایۂ عمومی کی بڑھوتری (accumulation) کا باعث بن سکے۔

سرمایہ حرص اور ہوس ہے۔ حرص اور ہوس کی اس تجسیم کو سرمایۂ عمومی کہتے ہیں جو معاشرہ میں پائے جانے والے افراد کی اجتماعی حرص اور ہوس کو بڑھانے (اسے maximise کرنے) کی دعوے دار ہو۔ سرمایہ کی بڑھوتری کی ایک مخصوص حکمت عملی اس وقت تک معقول تصور کی جاتی ہے جب تک کہ وہ عوام میں غالب گروہوں (ضروری نہیں کہ یہ عوام کی اکثریت پر مشتمل ہوں) کے تصور فروغ لذات سے ہم آہنگ ہو۔ ہر جمہوری حکومت (خواہ لبرل، خواہ قوم پرست، خواہ اشتراکی) اس کی مستقلاً پابند ہوتی ہے کہ وہ اپنی پالیسی سازی کے عمل کو عوام کے غالب گروہوں کا عکاس ہونے کا جواز پیش کرتی رہے۔

پھر عوامی اکثریت محض ایک مفروضہ ہے۔ عوام لازماً متصادم گروہوں میں بٹے ہوئے ہوتے ہیں اور ان میں سرمایۂ عمومی (GNP) کے غالب حصہ کی حصول کی کشمکش مستقلاً جاری رہتی ہے۔ پھر عوام کے ایک حصہ میں غالب جذبۂ محرکہ حرص اور حسد نہیں ہوتا مثلاً ۲۰۰۸ء میں اندازہ لگایا گیا کہ پاکستان میں مخلصین دین تقریباً ڈھائی کروڑ (آبادی کا تقریباً ۹ فیصد) ہیں۔ یہ ریاستی اور معاشرتی جمہوری عمل کو حرص و حسد کے فروغ کے لیے نہیں بلکہ حصولِ رضائے الٰہی کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ یہی ہمارا بنیادی حلقہ

constituency ہے اور اس کو ریاستی اقتدار سے جمہوری عمل سے باہر رکھنا سرمایہ دارانہ نظام کی اہم ضرورت ہے۔

جن ممالک کی آبادی سرمایہ دارانہ بنادی گئی ہے (مثلاً امریکا اور چین) یا بنائی جارہی ہے (مثلاً بھارت اور لاطینی امریکا) وہاں بھی سرمایۂ عمومی کی کسی ایک حکمت عملی پر قومی اجماع قائم رکھنا ایک مشکل کام ہے اور وہاں بھی سرمایہ داروں کے مختلف گروہ (سرمایہ کار فنانسرز، مزدور، قوم پرست، نچلے طبقہ کے ملازمین) سرمایۂ عمومی کی بڑھوتری کی مختلف النوع تشریحات پیش کرتے رہتے ہیں اور کبھی ایک گروہ غالب آتا ہے اور کبھی دوسرا اور یہ سرمایہ دارانہ نظام کا وہ دائمی تضاد (contradiction) ہے جو اس نظام حیات اور طرز زندگی کی نامعقولیت کا مستقلاً اظہار کرتا رہتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام میں عوام عموماً اپنے آپ کو محروم اور مظلوم تصور کرتے رہتے ہیں اور اظہارِ مظلومیت کے لیے گنجائش پیدا کرنا ایک اہم نظاماتی ضرورت بنتی رہتی ہے لیکن اس محکومیت اور مظلومیت کا اظہار نظام کے استحکام کے لیے خطرہ بھی ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ یہ اس بنیادی نظاماتی دعوے کی نفی ہے کہ سرمایہ دارانہ جمہوری نظام میں عوام خود حاکم ہوتے ہیں۔ لہٰذا عوامی اظہار محکومیت کو حدود میں منتظم (manage) رکھنے کے لیے جو ٹیکنالوجی ایجاد کی گئی ہے وہ عموماً دساتیر (constitutions) میں مضمر ہے۔ انتخابات اور مظاہروں دونوں کو دستوری ضوابط کا پابند بنایا گیا ہے اور جو انتخابات اور مظاہرے دستوری جکڑ بندیوں میں پیوست رہتے ہیں وہ عوامی محکومیت اور مظلومیت کو ختم نہیں کرتے زیادہ سے زیادہ، عوام کے سرمایہ دارانہ حقوق کے حصول کا ذریعہ بنتے ہیں اور ایک سرمایہ دارانہ دستور کی جگہ دوسرے سرمایہ دارانہ دستور اور کسی ایک سرمایہ دارانہ گروہ کی جگہ کسی دوسرے سرمایہ دارانہ گروہ کے حکم کے قیام کی راہ ہموار کرتے ہیں، تحکم قانون سرمایہ کو از سر نو مرتب کرنے کا باعث بنتے ہیں اور عوام ضوابطی تبدیلی کو اپنی کامیابی تصور کرتے ہوئے کچھ دیر کے لیے مطمئن ہو جاتے ہیں۔

اس قسم کے مفروضہ کامیاب مظاہرے کئی سابق سوویت یونین ممالک روس، پولینڈ، ہنگری، لاطینی امریکا، ارجنٹینا، بولیویا اور عرب ممالک (تیونس، مصر اور سوڈان) میں رونما ہوئے لیکن کہیں بھی سرمایہ دارانہ تحکم تبدیل نہ ہوا اور کامیاب مظاہروں کے بعد بھی عوام کی سرمایہ دارانہ محکومیت اور مظلومیت ختم نہ ہوئی۔ ہر جگہ ایک نئے دستور کے تحت تحکمِ سرمایہ اور تنفیذ قانون سرمایہ کا ایک نیا وطیرہ مرتب کر لیا گیا۔

اسلامی جماعتوں کی مصالحتی حکمت عملی

ہم اسلامی انقلابی ہیں۔ ہم مثالیاتی (idealistic) اور ابن الوقتی (pragmatic) نہیں ہیں۔ ہم ریاستی عمل میں شرکت کو ناگزیر سمجھتے ہیں۔ ہمیں اس بات کا ادراک ہے کہ پاکستان کے موجودہ حالات میں ریاستی عمل جمہوری نظاماتی ڈھانچہ میں مقید ہے۔ لہٰذا انتخابات اور احتجاجات سے پہلو تہی کوئی حقیقت پسندانہ رویہ نہیں۔ لہٰذا ہم انتخابات اور احتجاجات کو اسلامی انقلابی عمل کے ایک ذریعہ کے طور پر وضع کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ہمیں اس بات کا احساس ہے کہ اسلامی جماعتوں نے ملک کی تاریخ میں دو مرتبہ (۱۹۶۸-۶۹ اور ۱۹۷۷ء میں) ایسی احتجاجی مہمات میں حصہ لیا جس کے نتیجہ میں حکومتیں بھی تبدیل ہوئیں اور دستور میں تبدیلیاں بھی رونما ہوئیں لیکن تحکم قانون سرمایہ مزید مستحکم ہوا۔ یہ اس کے باوجود ہوا کہ میاں طفیلؒ کی ولولہ انگیز قیادت میں ہم نے دہریہ جماعتوں کو پیچھے دھکیل کر مارچ ۱۹۷۷ء سے احتجاجی عمل پر قبضہ کر لیا تھا۔

آج اسلامی جماعتیں یہ غلطی دہرانے پر آمادہ نظر آتی ہیں۔ سب سے بااثر اسلامی جماعت جمعیت علمائے اسلام جو لاکھوں نہیں تو ہزاروں اہل مدارس کو سڑکوں پر لا سکتی ہے، ایک دہریہ جماعت سے چند سرمایہ دارانہ مطالبات کی بنیاد پر معاہدہ کر رہی ہے۔ جماعت اسلامی اس ہی قسم کے مطالبات ایک دوسری دہریہ جماعت مسلم لیگ سے کر رہی ہے۔

جماعت کے بیانیہ میں درسِ انقلاب گم
جنازہ اٹھ گیا اب طفیل مغفور کا

سرمایہ دارانہ نظاماتی انہدام کا کوئی تصور کسی اسلامی جماعت کے پاس موجود نہیں۔ وہ سب تحکم قانون سرمایہ کو ناگزیر سمجھتی ہیں۔ وہ سب سرمایہ دارانہ عدل اور عوام کے سرمایہ دارانہ حقوق کے حصول کی جدوجہد کو تحفظ اور غلبہ دین کا وسیلہ گردانتی ہیں۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ جیسے جیسے معاشرے میں سرمایہ دارانہ حقوق فراہم کیے جائیں گے ویسے ویسے سرمایہ دارانہ انفرادیت فروغ پائے گی اور عوامی سطح پر دہریت پھیلے گی۔ یہ بات ترکی اور تیونس کے تجربات سے ثابت ہے جہاں کی سابقہ اسلامی جماعتیں اپنے ہاتھوں سے اپنی قبریں کھود رہی ہیں۔

انقلابی عمل کا مقصد عوام کو ان کے سرمایہ دارانہ حقوق دلانا نہیں بلکہ مطیع شریعت اسلامی بنانا ہے۔ انقلاب اسلامی کا بنیادی مقصد تحکم سرمایہ کی تحدید اور تحکم احکام شرع کے دائرہ کی توسیع ہے۔ آج تحکم احکام الٰہی کا دائرہ سکڑتا جارہا ہے۔ مخلصین دین تک جو کہ ملک میں ڈھائی کروڑ کے لگ بھگ ہیں، اتباع دائرہ شرع مطہرہ کو ذاتی زندگی تک محدود پاتے ہیں۔ نظم اجتماعی کے ہر دائرے میں، معیشت، ثقافت، عدالت، تعلیم، سیاست میں، ریاستی اداروں انتظامیہ، پولیس، کارپوریشن، مقننہ، فوج اور میڈیا کا تسلط قائم ہے اور یہ تمام ادارے سرمایہ دارانہ تحکم کو مستقلاً مستحکم کرتے رہتے ہیں۔ ان اداروں کی کارفرمائی کے تناظر میں لامحالہ مخلصین دین اور عوام اپنے آپ کو لاچار، بے بس اور مجبور پاتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ حقوق کی فراہمی سے ادارتی نظاماتی جبر متاثر نہیں ہوتا۔ مخلصین دین کے احساس بے بسی اور لاچارگی کو ختم کرنا ہے تو محض حکومت کو نہیں معاشرتی ترتیب اور ادارتی اقتدار کو بدلنا ہوگا۔ انقلاب اسلامی اس عمل کا نام ہے جس کے نتیجہ میں عوام اپنی خواہشاتِ نفسانی کی اتباع کو ترک کر کے احکامِ الٰہی کی اطاعت کو قبول کرلیں۔ آج پاکستان میں بالعموم جو مسلمان احکامِ الٰہی کی تنفیذ کو نفس امارہ کی خواہشات کی پیروی پر ترجیح دیتے ہیں تقریباً ملک کی آبادی کا

نو فیصد ہیں۔ لہٰذا اسلامی انقلابی عمل کا بنیادی ہدف ان مخلصین دین کی قیادت کو عوامی سطح پر قائم اور مستحکم کرنا ہونا چاہیے۔

اس کا مطلب مخلصین دین کی نظاماتی لاچارگی اور بے بسی کو بتدریج کم کرنا ہے۔ ان کو ملکی سطح پر اس طرح منظم کرنا ہے کہ وہ نظم اجتماعی (public sphere) میں تحکم (گورننس) کا فریضہ انجام دینے کے قابل ہو جائیں۔ یہ ریاست درون ریاست کی تعمیر کا کام ہے اور اس طریقہ سے معاشرتی فیصلہ سازی کے عمل کو غیر جمہوری خطوط پر مرتب کیا جا سکتا ہے۔ ملک میں موجود لاکھوں مساجد اس نئی ریاست درون ریاست ادارتی ڈھانچہ فراہم کر سکتی ہیں۔ ان میں بین المسالک وفاق قائم کیے جا سکتے ہیں جنہیں پہلے مقامی پھر علاقائی، پھر شہری، پھر صوبائی اور وفاقی پالیسی سازی اور پالیسی تنفیذی ذمہ داریاں سونپی جا سکتی ہیں۔ اسلامی انقلابی انتخابی اور احتجاجی سیاست کا مقصد اس ریاست درون ریاست کے تحکم و تنفیذی اختیارات میں مستقل توسیع اور حاصل شدہ اختیار کا دفاع ہونا چاہیے۔ یوں معاشرتی جمہوریتی تحلیل کے عمل کو ریاستی سطح تک پھیلایا جا سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ملک میں ابھی کوئی ایسا کثیر الجہتی ادارتی ڈھانچہ موجود نہیں۔ اس کو قائم کرنے کی ضرورت کا کوئی شعور عوام میں نہیں۔ اس شعور کو پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ملک کی اسلامی قوتوں میں اتحاد کا فروغ ہو۔ جب تک یہ اتحاد وجود میں نہ آئے اور ملک گیر کثیر الجہتی ادارتی صف بندی کی ضرورت کا احساس پیدا نہ ہو اسلامی مزاحمتی عمل لازماً تضاداتی رہے گا۔ ہمارا بیش تر مطالباتی عمل اسلامی نہ ہو گا بلکہ اس کے نتیجے میں اسلامی جماعتیں سرمایہ دارانہ حقوق کی عوامی فراہمی کا مطالبہ کر کے سرمایہ دارانہ دستوری جمہوری نظام میں ضم ہوتی رہیں گی اور اس غلط فہمی کا شکار رہیں گی کہ اس قسم کی مزاحمت کو فروغ دے کر وہ غلبہ دین کی راہ ہموار کر رہی ہیں۔ لیکن اگر اسلامی مزاحمتی عمل میں سرمایہ دارانہ حقوق طلبی کا رجحان کم یا ختم کر دیا جائے تو اس کے ذریعے کسی نہ کسی حد تک دفاعِ دین کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ تحریک لبیک کی شعائر اسلامی کی تحفظاتی مزاحمتوں سے واضح ہے۔ ۲۰۲۴/۲۰۲۵ میں

جمعیت علمائے اسلام نے بھی مزاحمتی عمل کی دھمکی دے کر مدارس کی نظاماتی خود کار فرمائی کو کامیابی سے فروغ دیا۔ اس قسم کے مظاہرے دستوری جکڑ بندیوں کو کم کیے بغیر بھی ملک میں دینی شعور کو پیدا کرنے کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔

پھر اسلامی مطالباتی مظاہروں کو سامراج مخالفت کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ مزاحمت محض علامتی، زبانی کلامی نہ ہو جیسا کہ ملک میں جاری اسرائیل مخالف اور کشمیر کے حق میں کیے جانے والے مظاہرے ہوتے ہیں۔ اس قسم کے مظاہروں کو موثر بنانا ہے تو ان کو ملک میں قائم سامراجی روابطی نظام کو متاثر کرنے کا ذریعہ بنانا ہو گا مثلاً آئی ایم ایف کے حالیہ ای ایف ایف EFF پروگرام کی منسوخی، بیرونی قرضہ جات کی ادائیگی کی منسوخی، امریکا اور یورپ سے تجارت اور سرمایہ کاری کے خاتمے کے مطالبات کیے جائیں اور مظاہروں کے پیچھے سامراجی فرنچائز اور درآمدات کے بائیکاٹ کی ملک گیر مہمات منظم کی جائیں۔ اس قسم کے مظاہرے بھی موجودہ دستوری تناظر سے ہم آہنگ بنائے جا سکتے ہیں اور کسی نہ کسی حد تک غلبۂ دین کی راہ ہموار کر سکتے ہیں کیونکہ سامراج انقلاب اسلامی کا اصل دشمن ہے اور ملکی سامراجی نظاماتی پیوستگی کو مجروح کرنا ہمارے کلیدی مقاصد میں سے ایک ہے۔

اصولاً یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ مزاحمتی اور انتخابی عمل کو جتنا زیادہ سرمایہ دارانہ اقداری اور نظاماتی تغلبی عمل سے کاٹا جائے گا اتنا وہ اسلامی انقلابی عمل کے لیے مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ چونکہ پاکستان کی تمام دہریہ جماعتیں (پیپلز پارٹی، مسلم لیگ، تحریک انصاف) سامراج نواز جماعتیں ہیں لہٰذا ان میں سے کسی سے بھی سامراج مخالفت کی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔ تحریک انصاف آج "حقیقی آزادی" کی کتنی بھی دہائی دے لے حکومت میں آ کر وہ امریکا کی بہترین خادم بننے کی کوشش کرتی رہے گی۔ وہ جمعیت علمائے اسلام کو محض حصول اقتدار کا ایک ذریعہ بنانے کی خواہش مند ہے۔ ہمیں اس سرمایہ دارانہ سراب کو ترک کر کے اتحاد اسلامی کو فروغ دے کر اسلامی انقلاب کی راہ ہموار کرنے کی کوشش کرتے رہنا چاہیے۔

☆☆☆

جہاد فلسطین: امکانات اور خدشات

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

جہاد فلسطین اس وقت سے (یعنی ۱۹۱۹ء) جاری ہے جب برطانیہ نے فلسطین پر قبضہ حاصل کر لیا تھا۔ ۱۹۴۹ء، ۱۹۵۶ء، ۱۹۷۳ء–۱۹۷۶ء اور ۲۴-۲۰۲۳ء جہاد کی پیش رفت میں اہم سال ہیں۔ یہ مضمون گذشتہ برسوں میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں ان سے بحث نہیں کرے گا بلکہ حالیہ صورت حال پر توجہ مرکوز کرے گا اور جہاد کے جاری رہنے اور کامیابی سے ہمکنار ہونے کے امکانات کا جائزہ لے گا۔

حالیہ صورت حال

جہاد کے حالیہ مرحلہ میں اس کے شرکاء حسب ذیل ہیں:

۱۔ حماس

۲۔ اسرائیل اور امریکا

۳۔ حزب اللہ

۴۔ ایران

۵۔ مجاہدین اسلام کے مقبوضہ علاقے

۶۔ بالواسطہ لبنان، شام اور مغربی ساحلی فلسطینی حکومت

حماس جہاد کے اس مرحلہ میں ان معنوں میں کامیاب رہی ہے کہ حالیہ معاہدہ کے تحت اسرائیل غزہ کا علاقہ خالی کرنے پر راضی ہو گیا ہے اور حماس کو ختم کرنے کا اس کا منصوبہ ناکام ہو گیا ہے اور ہزاروں فلسطینی مجاہدین اسرائیلی جیلوں سے آزاد کر دیے جائیں گے۔ لیکن یہ کامیابی ان معنوں میں جزوی ہے کہ اس کی بہت بڑی قیمت حماس کو برداشت کرنا پڑی۔ حماس کے ۶۰ ہزار کے قریب غیر حربی مجاہدین غزہ میں شہید کر دیے گئے۔ حماس کی فوجی تنصیبات بڑے پیمانے پر تباہ کر دی گئیں اور اس کے کئی کلیدی رہنما بھی شہید ہوئے۔ مزاحمت جاری

رکھنے کے لیے عوامی حمایت قائم رکھنا ایک مشکل کام ثابت ہو سکتا ہے۔

اسرائیل جہاد کے اس مرحلہ میں پسپائی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ نہ اس کی فوج غزہ پر مستحکم قبضہ کر سکی نہ جنوبی لبنان میں اور نہ حماس کو بے دخل کیا جا سکا۔ غزہ کی مسلم آبادی کو ملک بدر کرنے کی کوشش بھی ناکام ہوتی نظر آ رہی ہے۔ لیکن اس کا جانی اور مالی نقصان معمولی ہے۔ صرف ۶۰۰-۹۰۰ کے قریب فوجی جہنم واصل ہوئے۔ مالی نقصانات بھی نہایت محدود رہے۔ معیشت پر کوئی خاطر خواہ منفی اثر نہیں پڑا۔ ملک کے اندر جنگ مخالف تحریکیں غیر موثر رہیں۔ سفارتی نقصانات بھی عارضی رہے، حقیقی نہیں۔ نہ اسرائیلی بین الاقوامی تجارت متاثر ہوئی، نہ ترسیل زر اور ٹیکنالوجی۔ پورا مغربی بلاک اس کا پرزور حمایتی رہا اور جنگ مخالف عوامی مزاحمت بہت جلد دم توڑ گئی۔

جہاد کے اس مرحلہ سے سب سے زیادہ فائدہ امریکا کو ہوا۔ نہایت قلیل رقم (تقریباً ۷ بلین ڈالر کے اسلحہ کی فراہمی) کے عوض اس نے اسرائیلی ریاست پر اپنی گرفت مضبوط کر لی اور اسرائیل حکومت کو یہ بات قبول کرنے پر مجبور کر دیا گیا کہ وہ جنگ نہیں جیت سکتی اور اس کو طول دینا لاحاصل ہے۔ اس سے بڑی کامیابی اس کو عرب دنیا میں ہوئی۔ یمن کے علاوہ کسی عرب ملک نے جہاد کا ساتھ نہیں دیا نہ کسی عرب ملک نے اسرائیل یا امریکا سے اپنے تعلقات منقطع کیے۔ وہ سب امریکا کے باجگزار رہے۔

حزب اللہ نے حماس کا ساتھ دیا اور اس کے نتیجہ میں اس کی فوجی استعداد یقیناً متاثر ہوئی لیکن جنوبی لبنان سے اس کی بے دخلی عمل میں نہیں لائی جائے گی اور وہ جہاد فلسطین سے متعلق خدمات سے دستبردار نہیں کی جا سکی۔ ابھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ لبنان کی نئی حکومت جو امریکا نے قائم کی ہے حزب اللہ کو نقصان پہنچا سکتی ہے یا نہیں۔

ایران ۱۹۷۹ء سے لے کر آج تک جہاد فلسطین کا حمایتی رہا ہے۔ یہ حمایت آج تک جاری ہے لیکن ۲۰۲۳ء کے جہاد میں ایران نے اسرائیل کو کوئی واضح نقصان نہیں پہنچایا اور اسرائیل سے براہ راست تصادم سے گریز کی راہ اختیار کی ہے۔ ایران اور حزب اللہ کو اصل نقصان

شام میں تبدیلی سے ہوا ہے جہاں اسرائیل نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ فوجی تنصیبات تباہ کر دی ہیں جو حزب اللہ کو ایران سے فوجی رسد فراہم کرنے کے لیے استعمال کی جاتی تھیں۔

یمن کی جہاد فلسطین کی حمایت بھی علامتی ہے اور اس کے اثرات محدود رہیں گے۔ بحیثیت مجموعی امریکی، یورپی اور اسرائیلی مجموعی تجارتی روابط محفوظ رہیں گے۔ جہاد کے اس مرحلہ کے نتیجہ میں بحیثیت مجموعی اس علاقہ میں امریکا کی فوجی اور سفارتی گرفت مضبوط ہوئی ہے۔ دوسری سامراجی قوتیں بے دخل کر دی گئی ہیں۔ روس شام سے نکال دیا جائے گا (شاید لیبیا میں متبادل فوجی اڈا قائم کرنے کی کوشش کرے) جس کے نتیجے میں وہ عملاً غیر جانب دار رہے گا۔ یورپی قوتیں امریکی تسلط کو مضبوط کریں گی۔ علاقہ کے ممالک (اسرائیل، ترکی، سعودی عرب، شام اور مصر) امریکی باج گزاری قبول کرتے رہیں گے۔ کسی نہ کسی حد تک ترکی ریاستی خود مختاری کے فروغ پر زور دیتا رہے گا۔ شام بھی اگر وہاں ایک اسلامی حکومت قائم ہوئی خواہ جمہوری خواہ آمرانہ تو جلد یا بدیر جہاد فلسطین کی حمایت اور امریکی بالادستی کی مزاحمت کی راہ اختیار کرے گا۔

امکانات

ٹرمپ سرکار کی کوشش ہو گی کہ ان ابراہیمی معاہدوں کے تحت جو ۲۰۱۷ء، ۲۰۱۸ء میں نافذ کیے گئے تھے اسرائیل کو ایک ایسی فلسطینی انتظامیہ قائم کرنے پر راضی کرے جس کے اختیارات مقبوضہ مغربی ساحل کے چند بنجر علاقوں تک محدود ہوں اور جو پورے طور پر اسرائیل کے زیر نگیں ہو۔ یہ دور یاستی تجویز مشکل ہے لیکن اس کی طرف پیش رفت دو امور پر منحصر ہے۔

ایک تو یہ کہ موجودہ جنگ بندی جو صرف چالیس دن کے لیے کی گئی ہے اس میں توسیع ہوتی رہے۔ اسرائیل اپنی پسپائی کو قبول کرے اور دوبارہ غزہ پر حملہ آور نہ ہو اور ٹرمپ سرکار جنگ کو طول دینے پر آمادہ نہ ہو۔ دوسرا یہ کہ امریکا کی باج گزار عرب ریاستیں (سعودی

عرب، لبنان، مصر، یو اے ای وغیرہ) ابراہیمی منصوبہ کی مجوزہ مسخ شدہ تصور فلسطینی ریاست کو قبول کر لیں اور مجوزہ فلسطینی ریاست کی خود مختار حاکمیت میں توسیع پر اصرار نہ کریں۔ عملاً اس کا مطلب یہ ہو گا کہ بالخصوص سعودی عرب، مصر اور شام اسرائیل کی غیر مشروط علاقائی بالادستی کو قبول کر لیں۔ حالیہ جہاد کے دوران مصر نے اپنی غیر جانب داری سے ثابت کر دیا ہے کہ اس کے لیے اسرائیلی علاقائی بالادستی قبول کرنا دشوار نہیں۔ سعودی عرب کے موجودہ حکمرانوں نے اس ضمن میں کچھ تحفظات کا اظہار کیا ہے۔ کیا ان کی ایران مخالفت ان کو اسرائیلی نیو کلیئر چھتری کا پناہ گزین بننے پر آمادہ کر لے گی؟

شام کا رویہ اس بات پر منحصر ہو گا کہ وہاں کیسی حکومت قائم ہوتی ہے۔ اگر امریکا اپنے کرد عسکری حلیفوں کو بر سر اقتدار لائے گا اور ایک لبرل حکومت قائم ہو گئی تو شام کے لیے اسرائیلی علاقائی بالادستی قبول کرنا ناگزیر ہو جائے گا۔ اگر مجاہدین جمہوری حکومت میں غالب آ گئے (ایک اسلامی امارت کا قیام شام میں ممکن نظر نہیں آتا) تو جہاد فلسطین سے شام کی پسپائی وقتی ثابت ہونے کا امکان ہے۔ جلد یا بدیر HTS اور حزب اللہ میں اشتراک عمل فروغ پائے گا اور شامی اسلامی ریاست مجاہدین فلسطین کی حلیف بن جائے گی۔

ایران اور سنی مجاہدین دو ریاستی منصوبہ کی مخالفت کرتے رہیں گے اور حماس اور حزب اللہ کی پشت پناہی جاری رکھیں گے لیکن ان کی عسکری اور سفارتی استطاعت محدود ہے اور ایرانی نیو کلیئر تنصیبات کے تحفظ کے لیے ضروری ہے کہ اسرائیل سے براہ راست نبرد آزمائی سے گریز اختیار کیا جائے۔ علاقہ میں ایران کی گرفت مضبوط کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ شام سے اشتراک عمل کی راہ استوار کرے۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں کیونکہ ایران کی بشار الاسد کی حمایت شیعت کی بنیاد پر نہیں تھی (بعث پارٹی کی حکومت کا شیعت سے کوئی تعلق نہیں)۔ اسد کو ایران کی حمایت اپنی استعمار مخالفت کی بنیاد پر حاصل تھی۔ مجاہدین شام بھی سامراج مخالف اور مجاہدین فلسطین کے فطری حلیف ہیں۔ ایران کو شام کی حکومت کو (اگر وہاں اسلامی حکومت قائم ہوتی ہے) ان فوجی تنصیبات کی بحالی پر آمادہ کرنا چاہیے جہاں سے

حزب اللہ کو اسلحہ کی مدد فراہم کی جاتی تھی اور جس کو اسرائیل نے تباہ کر دیا ہے۔

دو ریاستی تجویز کی تنفیذ ہو یا نہ ہو حماس جہاد جاری رکھے گی اور حزب اللہ اور ایران اور یمن (اور ان شاء اللہ شام) اس کی پشت پناہی جاری رکھیں گے۔ اس جہاد کا مقصد اسرائیلی ریاست کا خاتمہ اور فلسطین میں ایک اسلامی ریاست کا قیام ہے۔ یہ ایک طویل المدت جدوجہد ہے جو ۲۰۲۳ء میں ایک نئے مرحلہ میں داخل ہو گئی۔ یہ جنگ جیتنے کے لیے ضروری ہے کہ عسکری کارروائیاں غزہ اور مقبوضہ مغربی ساحلی علاقوں تک محدود نہ رہیں بلکہ ان کا اصل مرکز یہودی ایئر بیس ہوں۔ اس مزاحمتی جدوجہد کا مقصد زیادہ سے زیادہ جانی اور مالی نقصان پہنچانا ہو اور شہری زندگی کو پر خطر اور غیر محفوظ بنانا ہو۔ حماس کے اکتوبر ۲۰۲۳ء جیسے اقدام کو بار بار دہرایا جائے تاکہ عام اسرائیلی شہری اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگے اور شہری زندگی پر ریاستی اسلامی گرفت مضبوط نظر آنے لگے۔ اس قسم کی کارروائیاں جون ۲۰۲۴ء سے تل ابیب اور یہودی آبادیوں میں شروع ہو گئی ہیں اور یہودی پروفیشنلز کی امریکا اور پیرس منتقل ہونے کی خبریں آنے لگی ہیں۔ غزہ میں یہودی آبادکاری کا منصوبہ اسی خطرہ کو ملحوظ خاطر رکھ کر منسوخ کر دیا گیا ہے اور مقبوضہ مغربی ساحلی علاقوں سے یہودی آبادکاروں کی نقل مکانی کی اطلاعات بھی عام ہیں۔ جیسے جیسے حماس ایسی گوریلا تنظیم میں تبدیل ہوتی جائے گی جس کی کارروائیوں کی زد میں عام یہودی بستیاں ہوں ویسے ویسے ایک عام شہری یہودی ریاستی فعالیت سے مایوس ہونا شروع ہو جائے گا اور جیسے جیسے عوامی مایوسی اور جہادی رجحانات فروغ پائیں گے ویسے ویسے اسرائیلی سامراجی حمایت میں بھی تخفیف متوقع ہے۔ اس نوعیت کی حکمت عملی کامیابی کے ساتھ بیسویں صدی میں جنوبی افریقہ، ملاوی، انگولا اور موزمبیق میں اپنائی گئیں جہاں کی عوامی مزاحمتی تحریکوں نے گوریلا کارروائیوں کے ذریعے سفید فام ریاستی مقتدرہ کو بے دخل کر دیا اور ان ممالک سے بڑے پیمانے پر سفید فام افراد نقل مکانی کر گئے۔ جنوبی افریقہ سے سفید فاموں کی نقل مکانی محدود رہی۔ ان ممالک میں جو نئی ریاستیں قائم ہوئیں وہ سب سرمایہ دارانہ جمہوری ریاستیں تھیں اور ان کے قیام کے نتیجہ میں ان ممالک

میں سرمایہ دارانہ گرفت مجروح نہیں ہوئی۔

جب مزاحمتی تحریک کامیابی حاصل کر لیتی ہیں تو سامراج ان سے معاہدہ بازی پر آمادہ ہو جاتا ہے اور اس بات کا خطرہ موجود ہے کہ اس قسم کے سمجھوتے پر حماس کو راضی کر لیا جائے گا اور وہ فلسطین میں ایک دہریہ ریاست کے قیام کو قبول کر لے۔ اس خطرہ کو ٹالنے کے لیے ضروری ہے کہ ایران میں اسلامی حکومت قائم رہے اور مصر، شام، سعودی عرب اور ایران کے اسلامی حلقے حماس کی جدوجہد کی بھرپور حمایت کرتے رہیں اور حماس پر واضح کریں کہ ہمارا اصل مقابلہ امریکا سے ہے اور اسرائیلی ریاست کا خاتمہ علاقے سے امریکا کی پسپائی کو یقینی بنانے کے لیے کافی نہیں۔ یہاں امریکا اپنا دوسرا باج گزار آلہ کار سعودی عرب اور مصر کی شکل میں تلاش کر سکتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ موثر بائیکاٹ کے ذریعے پوری مسلم دنیا کو امریکی تجارتی اور سرمایہ کاری کے تسلط سے نجات دلوائی جائے۔

☆☆☆

امریکا کی فلسطینیوں کی بے دخلی کی حکمت عملی: جہاد فلسطین پر اثرات اور اس کے خلاف حکمت عملی کا جائزہ

سید محمد یونس قادری

اس تحریر کا مقصد فروری ۲۰۲۵ء میں امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کی جانب سے پیش کردہ متنازعہ منصوبے کا تجزیہ کرنا ہے، جس کے تحت غزہ پٹی کا کنٹرول سنبھال کر وہاں کے تقریباً ۲۰ لاکھ فلسطینی باشندوں کو پڑوسی ممالک میں منتقل کرنے کا منصوبہ شامل ہے۔ اس منصوبے کو "مشرق وسطیٰ کی رویرا (Riviera of the Middle East)" کے طور پر پیش کیا جارہا ہے، جس میں غزہ کو ایک جدید، پر تعیش سیاحتی مقام میں تبدیل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا گیا ہے۔ تاہم یہ اقدام فلسطینی مجاہدین اور جہادی تنظیموں کے لیے ایک نیا چیلنج اور ردِ عمل کا باعث بن سکتا ہے۔ اس مضمون میں اس پالیسی کے ممکنہ اثرات، عالمی رد عمل، اور اس کے خلاف مجاہدین کی ممکنہ حکمت عملیوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

امریکا کا منصوبہ اور اس کے پس پردہ عوامل

ٹرمپ کا یہ منصوبہ فلسطینی جہاد کو ختم کرنے اور غزہ کو ایک اقتصادی مرکز میں تبدیل کرنے کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ اس حکمت عملی کا مقصد بظاہر فلسطینی عوام کو ایک بہتر معاشی ماحول فراہم کرنا ہے، لیکن حقیقت میں یہ انہیں ان کے آبائی علاقوں سے بے دخل کرنے کی کوشش سمجھی جارہی ہے۔ اس منصوبے میں درج ذیل اقدامات شامل ہیں

- فلسطینی باشندوں کی زبردستی نقل مکانی
- غزہ میں عالمی سرمایہ کاری اور سیاحت کو فروغ دینا
- اسرائیل کے لیے سکیورٹی خطرات کو کم کرنا
- امریکا اور اس کے حواری ممالک کی فلسطین پالیسی کو مزید تقویت دینا

ڈونلڈ ٹرمپ کے اس بیانیے کی حیثیت

ڈونلڈ ٹرمپ بحیثیت امریکی صدر کے ایک اہم شخصیت ہیں اور ان کے بیانات ان کی ذاتی سوچ یا انتظامیہ کی ترجیحات کو ظاہر کرتے ہیں، لیکن ان بیانات کو عملی شکل دینے میں اکثر سیاسی، قانونی، اور اداراتی مسائل در پیش آتے ہیں۔ اگرچہ ان کے بیانات میں ان کی پالیسیوں کی جھلک ہوتی ہے، لیکن یہ ہمیشہ قابل عمل پالیسیوں میں تبدیل نہیں ہوتے جب تک کہ انہیں امریکی حکومت کے دوسرے شعبوں، خاص طور پر کانگریس، اور عالمی کمیونٹی سے مکمل حمایت نہ ملے۔ مثال کے طور پر، ٹرمپ کے فلسطین کے بارے میں متعدد متنازعہ بیانات پر انہیں عالمی رہنماؤں، بین الاقوامی تنظیموں اور یہاں تک کہ امریکی حکومت کے بعض حصوں کی طرف سے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا ہے، جس کی وجہ سے ان پالیسیوں کو مکمل طور پر نافذ کرنے میں مشکلات پیش آ رہی ہیں۔ ان بیانات کو اکثر ایک سیاسی یا اسٹریٹجک موقف کے طور پر لیا جاتا ہے نہ کہ کسی ٹھوس عمل کے طور پر، جو ان کی عمل داری میں لچک فراہم کرتا ہے۔ اس لیے، اگرچہ ٹرمپ مرکزی شخصیت ہیں، ان کے بیانات کا حقیقی دنیا پر اثر، سیاسی حرکیات اور عالمی سرمایہ دانہ نظام میں محدود ہوتا ہے۔

اس بیانیے کی اصل حقیقت

ڈونلڈ ٹرمپ کا یہ بیانیہ بظاہر اس کی ذاتی رائے لگ رہا ہے مگر یہ امریکا کی سرمایہ دارانہ پالیسی کا ہی شاخسانہ ہے۔ امریکی حکمت عملی کا پہلا قدم کسی بھی مخالف ملک کی معاشی، فوجی اور سیاسی طاقت کو کمزور کرنا ہوتا ہے۔ اس کے لیے وہ دو طرح کی پالیسیاں اپناتا ہے۔

ا۔ سخت گیر (Hard power) پالیسی

ایک پالیسی کو اس کی سخت گیر (Hard power) پالیسی کہتے ہیں۔ جس میں وہ طاقت کے زور پر کسی ملک میں فوجی کارروائی کر کے اس ملک کو تباہ کر دیتا ہے۔ اس ملک کی آبادی کو یا ختم کر دیتا ہے یا اس کو اس ملک سے بے دخل کر دیتا ہے۔ یہی کچھ اس نے فلسطین میں کیا۔

عسکری میدان میں اس کو یہ کامیابی ہوئی ہے کہ اس نے غزہ میں حماس کے امن اور فلسطین کے انفراسٹرکچر کو تباہ کر دیا ہے۔ جس کے نتیجہ میں بڑی تعداد میں فلسطینیوں کو اپنے گھروں سے بے دخل ہونا پڑا یا اپنی جانیں دینی پڑیں۔ مگر امریکا حماس کو عسکری طور پر شکست دینے میں ناکام ہو گیا ہے۔ اندرونی اور بیرونی دباؤ کی وجہ سے حماس سے امن معاہدہ کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔

۲۔ نرم گیر (Soft power) پالیسی

عسکری طاقت کی ناکامی یا کامیابی کے بعد اس کا دوسرا اقدام نرم گیر پالیسی (Soft power) کا استعمال ہے۔ اس پالیسی کے مطابق امریکا عالمی اداروں جیسے ورلڈ بینک، آئی ایم ایف اور این جی اوز کے ذریعے متاثرہ ممالک کی دوبارہ تعمیر اور معاشی اصلاحات کرتا ہے، مگر اس عمل کا مقصد صرف ملک کی معاشی حالت کو بہتر بنانا نہیں ہوتا بلکہ ان ممالک کو امریکی سرمایہ دارانہ نظام میں جکڑنا ہوتا ہے۔ ایک بار جب یہ ممالک امریکی سرمایہ دارانہ نظام میں جکڑ جاتے ہیں تو امریکا کا معاشی، تجارتی اور ثقافتی اثر ان ممالک پر بڑھتا جاتا ہے۔ ویتنام کی مثال سے یہ واضح ہوتا ہے کہ امریکا نے اس ملک میں اپنے ثقافتی اثرات کو بھی مستحکم کیا ہے۔ ویتنام میں امریکی عسکری شکست کے بعد ۲۰۰۰ء کے آخر میں ویتنام نے سوشلزم کے نظام کو ترک کیا اور امریکی مارکیٹ کے ساتھ تجارتی تعلقات بڑھانے شروع کیے۔ آج ویتنام میں امریکی کلچر کی موجودگی ہے اور امریکی کمپنیوں کا اثر بڑھا ہے۔ چین میں ۱۹۷۰ء میں اصلاحات کے بعد امریکی سرمایہ داری کا اثر بڑھا اور اس کے نتیجے میں چین میں امریکی ثقافت وہاں مقبول ہو رہی ہے۔

ٹرمپ کے منصوبے کی ناکامی کے بعد امریکی حکمت عملیاں کیا ہو سکتی ہیں؟

اس کی سخت گیر پالیسی کا پہلا داؤ ٹرمپ کا فلسطینیوں کو بے دخل کرنے کا منصوبہ اپنی حقیقت میں ناقابل عمل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عالمی سطح پر ٹرمپ کو بہت محدود حمایت حاصل ہے اور امریکا کی پالیسی کے خلاف احتجاجات بڑھتے جا رہے ہیں۔ اسرائیل نے تقریباً ۱۵ مہینے

تک اپنی تمام فوجی قوت کو استعمال کیا اور ہر قسم کا اسلحہ اور بھاری ترین بم استعمال کیے لیکن وہ فلسطینیوں کو غزہ سے نہیں نکال سکا اور اس کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے کہ امریکا اپنی فوج کو غزہ میں بھیجے گا اور اگر بھیجے بھی تو اس کا وہی انجام ہو گا جو اسرائیلی فوج کا ہوا ہے۔ اس ناکامی کے بعد امریکا اور اسرائیل کی حکمت عملی میں نمایاں تبدیلیاں ہو سکتی ہیں۔ وہ حماس کو کمزور کرنے کی کوشش کریں گے اور غزہ کے فلسطینیوں کو اقتصادی اور سیاسی لحاظ سے مزید غیر مؤثر بنانے کے لیے ایک نئی نرم گیر پالیسی اپنائیں گے۔ جو اس طرح ہو سکتی ہے:

۱۔ حماس کو کمزور کرنا

اس نئی حکمت عملی میں حماس کو کمزور کرنے کے لیے امریکا اور اسرائیل کے زیر نگرانی امداد اور تعمیر نو کے منصوبے شروع کیے جاسکتے ہیں۔ ان منصوبوں میں فلسطین کے مختلف حصوں میں معاشی اور تعمیراتی سرگرمیاں شروع کی جائیں گی، مگر یہ سب کچھ اسرائیل اور امریکا کے مفادات کے تابع ہو گا۔ حماس کے زیر کنٹرول علاقوں میں امداد اور ترقیاتی کاموں کا امکان کم ہو گا، کیونکہ امریکا اور اسرائیل حماس کی حکمت عملی کو اپنے مفادات کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں۔

۲۔ امداد اور تعمیر نو کے تحت اسرائیل اور امریکا کا اثر بڑھانا

اگر فلسطین کی تعمیر نو کے لیے تمام امداد امریکا اور اسرائیل کے زیر انتظام ہوئی تو اس سے ان کو یہ فائدہ ہو گا کہ دونوں ممالک فلسطینی معیشت اور سیاسی نظام پر اپنی گرفت مزید مضبوط کر سکیں گے۔ امریکا اور اسرائیل کے زیر اہتمام ہونے والے تعمیراتی منصوبے فلسطینی معاشرتی اور اقتصادی ڈھانچے میں ایسی اصلاحات لائیں گے جو اسرائیلی مفادات کے مطابق ہوں۔ ان اصلاحات میں ممکنہ طور پر فلسطینیوں کی خود مختاری کو کمزور کرنا، اسرائیل کے ساتھ اقتصادی تعلقات بڑھانا، اور امریکا کے سرمایہ دارانہ اصولوں کے تحت فلسطینی معیشت کو ڈھالنا شامل ہو گا۔

۳۔ مذہبی اور ثقافتی اثرات

امریکا اور اسرائیل کی تعمیر نو کی حکمت عملی کا ایک اور پہلو فلسطین میں مغربی ثقافت اور نظریات کی ترویج ہو سکتی ہے۔ امریکا اور اسرائیل کی جانب سے ملنے والی امداد کو، خاص طور پر تعلیمی اور ثقافتی پروگراموں کے ذریعے، فلسطینی معاشرتی ڈھانچے میں مغربی اصولوں کو فروغ دینے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس کا مقصد فلسطینی عوام کو مغربی اقتصادی، سیاسی اور سماجی نظام کے تحت لانا ہو سکتا ہے، تاکہ وہ امریکا اور اسرائیل کے مفادات کے ساتھ مزید ہم آہنگ ہو جائیں۔

ٹرمپ کے بیانیے کا مجاہدین کو ممکنہ فائدہ

ٹرمپ کا بیانیہ سابقہ مجاہدین اور دیگر اسلامی لیڈروں کے خدشات کی تائید ہے۔ جس میں خاص کر اسامہ بن لان کے ۱۹۸۰ کے اس دعوے کی توثیق ہوئی ہے کہ امریکا اسرائیل کے ساتھ مل کر فلسطین پر مکمل قبضہ جمانا چاہتا ہے اور وہاں کے مسلمانوں کو یا تو قتل کرنا چاہتا ہے یا بے دخل کر کے بے وطن بنانا چاہتا ہے۔ انہوں نے فلسطین کی صورتحال کو عالمی جہاد کے لیے ایک بڑا جواز بنایا اور کہا کہ جب تک امریکا اسرائیل کی مدد کرتا رہے گا، مسلم دنیا کو جہاد کے ذریعے مزاحمت کرنی چاہیے۔ اس کے علاوہ آیت اللہ امام خمینی نے ۱۹۷۹ء میں امریکا کو ہمیشہ "شیطان بزرگ" کے طور پر پیش کیا تھا۔ امام خمینی نے بھی نہ صرف ایران بلکہ تمام مسلمانوں کو امریکا کے خلاف جدوجہد کرنے کا مشورہ دیا تھا کہ مسلمانوں کا اصل دشمن امریکا ہے۔ اس منصوبے کی مخالفت فلسطینی جہادی گروپوں کے لیے ایک سنہری موقع بھی فراہم کر سکتا ہے کیونکہ یہ انہیں اپنے بیانیے کو مزید مستحکم کرنے کا جواز فراہم کرتا ہے۔ فلسطینی جہادی تنظیمیں بشمول حماس اس منصوبے کو اپنے جہادی اقدامات کے لیے بنیاد بنا سکتی ہیں اور اسے فلسطینی عوام کے ساتھ ہونے والی زیادتی کے طور پر پیش کر سکتی ہیں۔ اس طرح کا منصوبہ فلسطینیوں میں غصہ اور نفرت کو بڑھا سکتا ہے، جس سے مسلح مزاحمت اور جہاد میں مزید شدت آ سکتی ہے۔ ان گروپوں کا دعویٰ ہو گا کہ وہ فلسطینی عوام اور اسلام کے دفاع کے لیے

لڑ رہے ہیں اور اس منصوبے کو ایک اور ظلم کے طور پر پیش کر کے عالمی سطح پر حمایت حاصل کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ فلسطینیوں کے خلاف اس اقدام کو ایک جنگی مظلومیت کے طور پر پیش کر کے عالمی برادری میں فلسطینیوں کے حق میں احتجاجات کو مزید تیز کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ، اس منصوبے سے خطے میں جہادی لہر کو فروغ مل سکتا ہے، جس کے نتیجے میں امریکی اور اسرائیلی مفادات کے خلاف جنگوں اور حملوں کو بڑھایا جا سکتا ہے۔

مجاہدین کی ممکنہ حکمت عملیاں

مجاہدین کی حکمت عملی اس وقت ٹرمپ کے ۲۰۲۵ء کے منصوبے کے خلاف مختلف زاویوں سے ہو سکتی ہے۔ ان کی حکمت عملی کا مقصد امریکی اور اسرائیلی پالیسیوں کے خلاف مزاحمت کرنا اور فلسطینیوں کی سرزمین کی آزادی کو ممکن بنانا اور اسرائیل کا مکمل خاتمہ ہے۔

- مجاہدین ممکنہ طور پر غزہ اور مغربی کنارے میں مسلح مزاحمت کو فروغ دیں گے، جیسا کہ حماس اور اسلامی جہاد نے ماضی میں کیا ہے. مجاہدین کے گروہ اسرائیلی فوج اور امریکی مفادات کے خلاف کارروائیاں تیز کر سکتے ہیں، جیسے راکٹ حملے، خودکش بم حملے اور دیگر شدت پسند کارروائیاں۔
- فلسطینی جہادی گروہ دنیا بھر میں مظاہرے اور احتجاج منعقد کروا سکتے ہیں تاکہ عالمی برادری کو اس منصوبے کے خلاف بیدار کریں۔ وہ مسلم ممالک اور دیگر امریکا و اسرائیل مخالف ممالک سے حمایت حاصل کرنے کے لیے سفارتی اور میڈیا مہم چلا سکتے ہیں، تاکہ ان ممالک پر دباؤ ڈالا جا سکے کہ وہ فلسطینی عوام کے حقوق کا دفاع کریں۔
- مجاہدین اس منصوبے کو امریکی استحصال اور فلسطینیوں کی نسل کشی کے طور پر پیش کرتے ہوئے اس کے خلاف پروپیگنڈہ کر سکتے ہیں۔ وہ سوشل میڈیا اور دیگر پلیٹ فارمز پر اپنی آواز بلند کر کے عالمی رائے عامہ کو فلسطینیوں کے حق میں متحرک کر سکتے ہیں۔
- مجاہدین اس انسانی بحران کو اپنے مفاد میں استعمال کرتے ہوئے فلسطینی پناہ

گزینوں کی مدد کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں، ان کے لیے فلسطین اور مقبوضہ اسرائیل میں جغرافیائی اور سیاسی سطح پر پناہ گاہ فراہم کرنے کی کوششیں کر کے عالمی حمایت حاصل کر سکتے ہیں۔

- فلسطینی جہادی گروہ ممکنہ طور پر اپنے داخلی اختلافات کو مٹا کر ایک مشترکہ محاذ تشکیل دے سکتے ہیں، تاکہ ایک متحدہ فلسطینی تحریک کے ذریعے امریکی اور اسرائیلی منصوبوں کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے، خاص کر حماس اور حزب اللہ کا اتحاد۔ اس میں مسلم دنیا کی اکثریت کو ایک آواز میں لے کر عالمی سطح پر فلسطینی جہاد کے لیے سیاسی دباؤ بنانے کی کوشش کی جانی چاہیے ہیں۔
- امریکا کے حواری مسلمان حکمرانوں خاص کر سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، مصر اور پاکستان امریکا کی پالیسی میں اس کا ساتھ دے سکتے ہیں۔ اس خطرہ سے نمٹنے کے لیے ان ممالک میں موجود اسلامی گروہوں اور تنظیموں کو اپنی حکومت پر دباؤ ڈالنا چاہیے تاکہ ان کی حکومتیں امریکا کے ساتھ مل کر فلسطینیوں کی جدوجہد کے خلاف تخریب کاری سے باز رہیں۔ حماس اور دیگر اسلامی جہادی گروہوں کو اسلامی ممالک میں اسلامی گروہوں سے رابطہ رکھنا ہو گا تاکہ ان گروہوں اور ان کے کارکنان کو جہاد فلسطین سے پیوستہ رکھا جا سکے۔
- اگر حماس کو اس نئی حکمت عملی کے تحت کمزور کیا جائے، تو اس کے لیے یہ چیلنج ہو گا کہ وہ اپنی مقبولیت اور طاقت کو برقرار رکھے، خاص طور پر جب امریکا اور اسرائیل فلسطینی معیشت اور سیاست پر اثرانداز ہوں۔ حماس کو نہ صرف اسرائیل کی فوجی طاقت سے نمٹنا ہو گا بلکہ اسے بین الاقوامی سطح پر حمایت حاصل کرنے کی کوشش بھی جاری رکھنی ہو گی۔ حماس کو اس بات کا ادراک کرنا ہو گا کہ امریکا اور اسرائیل کی امداد اور تعمیر نو کی حکمت عملی فلسطین میں امریکی / اسرائیلی اثرات کو مزید بڑھا سکتی ہے اور حماس کے لیے فلسطینی عوام کی حمایت کو کم کر سکتی ہے۔ امریکا کی نرم گیر پالیسی کا بھی جہادی روح سے مقابلہ کرنا ہو گا۔
- یہ حکمت عملیاں اس بات پر منحصر ہوں گی کہ مجاہدین کس حد تک اپنے وسائل اور مقامی حمایت کو مؤثر انداز میں استعمال کر پاتے ہیں۔

تبصرۂ کتب ورسائل

پروفیسر بیونگ چل ہان کے مضمون ”انقلاب کیوں ممکن نہیں“ پر ایک تبصرہ

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

سرمایہ دارانہ معذرت خواہ ہیگل سے لے کر رارٹی اور ہابرماس تک سرمایہ دارانہ نظام کے عالمی تسلط کو ناگزیر ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ ان کی دلیلیں فرسودہ تو ہیں لیکن ان کی اثر پذیری سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ آج ڈاکٹر محمد امین جیسا معتبر عالم دین ان فرسودہ دلیلوں سے متاثر نظر آتا ہے۔

اس مضمون میں پہلے پروفیسر بیونگ چل ہان (Byung-Chul Han) کی دلیلیں چند نکات کی شکل میں پیش کروں گا اور پھر اسلامی انقلابی تناظر میں ان کا نقد مرتب کرنے کی کوشش کروں گا۔

پروفیسر بیونگ چل ہان کا موقف

پروفیسر صاحب دورِ حاضر میں انقلابی جدوجہد کو مندرجہ ذیل وجوہات کی بنیاد پر ناممکن قرار دیتے ہیں:

۱۔ آج محنت کشوں کا استحصال جبری اور پر تشدد نہیں ہے۔

۲۔ آج استحصال کرنے والے اور جس کا استحصال کیا جا رہا ہے میں فرق واضح اور نمایاں نہیں۔

۳۔ نظام کو دوام بخشنے والی قوت ترغیبی (seductive) ہے انسدادی (repressive) نہیں۔

۴۔ آج محنت کش کو ایک آزاد سوداکار (free contractor) بنا دیا گیا ہے وہ اپنا استحصال خود کرتا ہے۔

۵۔ طبقاتی کش مکش دخولی بنا دی گئی ہے۔ ہر شخص اپنی ناکامیوں کا ذمہ دار اپنے آپ کو خود

تصور کرتا ہے۔

۶۔ سرمایہ دارانہ عمل میں شمولیت کو فرد مجبوری نہیں گردانتا بلکہ اس کے عدل پر انحصار کرنے پر راضی اور مطمئن ہے۔

۷۔ آج عوام آزادی کے ساتھ اپنے نفس کی سرمایہ کاری خود کرتے ہیں اور بخوشی اپنے بارے میں اطلاعات سرمایہ کار کارپوریشنوں کو فراہم کرتے رہتے ہیں۔

۸۔ آج ریاست کے خلاف جدوجہد نامعقول گردانی جارہی ہے کیوں کہ ریاستی قوت کا اظہار دوستانہ اور اسمارٹ انداز میں کیا جاتا ہے۔ سرمایہ کا عبد اپنے آپ کو آزاد محسوس کرتا ہے۔ سرمایہ آزادی کی تحدید نہیں کررہا، آزادی کا استحصال کررہا ہے۔

۹۔ عام لوگ سرمایہ دارانہ تغلب پر راضی اور مطمئن ہیں اور ذاتی زندگی میں اس تغلب کی قیمت خودکشی کی شکل میں دے رہے ہیں۔

۱۰۔ آج سرمایہ دارانہ نظم کار تنہاذات کے بیوپاریوں پر انحصار کرتا ہے جو اجتماعی انقلابی عمل کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔

۱۱۔ سماجی اشتراک عمل کی تحریکیں ان معنوں میں ناکام ہیں کہ ان کے نتیجہ میں زندگی کا ہر شعبہ سرمایہ کارانہ نظام میں ضم ہوجاتا ہے۔

اسلامی نقد

پروفیسر بیونگ چل ہان دلیوزاور گوتاری کے پیرواور ایک پوسٹ مارکسسٹ مفکر ہیں۔ انہوں نے سرمایہ دارانہ نظام کی جو مثالیاتی تشریح کی ہے وہ مسلم دنیا کے لیے بالکل اجنبی اور نامانوس ہے۔ دور حاضر انقلاب اسلامی کی پیہم کامیابیوں کی صدی ہے۔ ایران اور افغانستان میں اسلامی انقلاب برپا ہوچکے ہیں اور سامراج کی نصف صدی سے زیادہ جاری رہنے والی کوششوں کے باوجود ان انقلابوں کے سرمایہ دارانہ نظام میں تحلیل ہونے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ فلسطین، چاڈ، برکینا فاسو، مالی، لبنان، یمن اور وسطی افریقہ میں دیرپا جہادی عمل جاری ہے اور مجاہدین اسلام رزم حیات کے ہر مورچہ پر سامراج سے چومکھی لڑائی لڑرہے

ہیں۔

خس و خاشاک سے ہوتا ہے گلستاں خالی
کارِ بر انداز ہے خون شہدا کی لالی
دیکھ گردوں کا رنگ تو عنابی ہے
یہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے

ہم اسلامی انقلابی ہیں۔ بیسویں صدی کے وسط میں اسلامی فکر میں وہ اجتہاد رونما ہوا جس کے نتیجہ میں ہم سامراج کا مقابلہ کرنے کے لیے بیدار ہو گئے۔ یہ اجتہاد ہمارے دو اہم تحریکی فکری رہنماؤں مولانا مودودی اور امام خمینی نے مرتب فرمایا۔ اس اجتہاد کے مطابق دور حاضر میں احیائے اسلام کے لیے سرمایہ دارانہ ریاست سے نبرد آزمائی ضروری ہے۔

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

اس اجتہاد کی روشنی میں ہم سامراج پر حملہ آور ہیں اور الحمدللہ پوری دنیا میں اس اجتہاد کی روشنی پھیل رہی ہے اور ہم کامیابیوں پر کامیابیاں حاصل کر رہے ہیں۔

ہماری جدوجہد پوری دنیا میں سرمایہ دارانہ نظام زندگی کے پھیلاؤ اور سرمایہ دارانہ انفرادیت کے فروغ کے خلاف ہے۔ پروفیسر بیونگ چل ہان سرمایہ دارانہ انفرادیت اور معاشرت کے تغلب کو لازمی اور دائمی تصور کرتے ہیں۔ وہ آزادی کی عوامی پوجا پاٹ کو بھی ناگزیر خیال کرتے ہیں یعنی سرمایہ دارانہ انفرادیت اور اس کا نظاماتی غلبہ تاریخی نہیں قدرتی ہے۔ حقیقت اس کے بالکل برخلاف ہے۔ انیسویں صدی کے وسط تک یورپ میں نہ سرمایہ دارانہ انفرادیت عام تھی نہ سرمایہ دارانہ تعقل عام تھا۔ سرمایہ دارانہ انفرادیت شہوت پرستی کی پلید پیداوار ہے اور سرمایہ داری جن نظاماتی بحرانوں کا شکار ہے وہ اس شہوت پرستی کے عواقب کا ایک اظہار ہے۔

الحمدللہ سامراج اور سامراج نواز مسلم ریاستوں کی پیہم کوششوں کے باوجود سرمایہ دارانہ انفرادیت اور سرمایہ دارانہ معاشرت کا پھیلاؤ مسلم دنیا میں محدود ہے اور اس پھیلاؤ کو روکنے

کی جدوجہد مسلکی جماعتیں، علمائے کرام اور صوفیائے عظام نہایت تن دہی اور جان فشانی سے کر رہے ہیں۔ ہمارا مذہبی نظام تدریس اور تربیت محفوظ ہے۔ ہمارے مذہبی رسوم اور رواج عوامی زندگی میں پیوست ہیں۔ ہمارا خاندانی اور برادری نظام مستحکم ہے۔ ایک عام مسلمان شیزوفرینیا کا شکار نہیں نہ وہ قنوطی ہے نہ تنہا نہ دین سے بدظن۔

یہ مانا کہ فرائض میں ہیں سب ہی قاصر
نہ مشغول باطن نہ پابند ظاہر
مساجد سے غائب ملاہی میں حاضر
مگر ایسے فاسق ہیں ان میں نہ فاجر
کہ مذہب پہ حملے ہیں جوہر طرف سے
وہ دیکھ ان کو ہٹ جائیں راہِ سلف سے

ہماری معیشت کا بڑا حصہ غیر سرمایہ دارانہ خطوط پر منظم ہے۔ حلال رزق دستیاب اور میسر ہے۔ ہمارے بازار اسلامی روایات اور برادرانہ عصبیت کا مظہر ہیں۔ ایک عام تاجر اور کاروباری نہ سود کے مارکیٹ سے تعلق رکھتا ہے نہ سٹہ کے مارکیٹ سے۔

پھر سامراجی معاشی نظام کا تسلط مسلم دنیا کے استحصال کا باعث ہے۔ سامراجی استحصال ریاستی جبر کو فروغ دے رہا ہے۔ مسلم دنیا میں ذات کے سوداکار نہ ہونے کے برابر ہیں۔ سامراجی معیشت سے متعلق تمام کاروبار ملٹی نیشنل کمپنیوں کے زیر دست ہیں اور فناشلائزیشن کا عمل مسلم ریاستوں اور مسلم کاروباریوں کو قرضوں کے ناقابل برداشت بوجھ تلے دبائے چلا جارہا ہے۔ یہ تمام مسائل مسلم دنیا میں سرمایہ دارانہ انفرادیت اور سرمایہ دارانہ آزاد معیشت کے پھیلاؤ کی راہ میں بڑی رکاوٹیں ہیں بالخصوص اس لیے کہ علمائے کرام، صوفیائے عظام اور مسلکی جماعتوں کی مساعی جلیلہ کے نتیجہ میں اسلامی انفرادیت اور معاشرت کی جڑیں مضبوط اور مستحکم ہیں۔

مسلکی جماعتوں، علمائے کرام اور صوفیائے عظام کی اصلاحی جدوجہد انقلاب اسلامی کی پشت

پناہ ثابت ہو سکتی ہے اور ہم مسلم ممالک میں سرمایہ دارانہ ریاستی نظام کو مسخر کر کے سامراج کو مسلم دنیا سے بے دخل کر دیں گے۔ مسلم دنیا میں کوئی سرمایہ دارانہ تغلب برپا ہونا ممکن نہیں لیکن اسلامی انقلاب ناگزیر ہے۔

یورپ اور امریکا میں سرمایہ دارانہ انقلابات یعنی اشتراکی یا قوم پرستی انقلابات کی وقوع پذیری محدود ہے اور وہاں مسلم دنیا کے مقابلہ میں سرمایہ دارانہ انفرادیت اور تعقل کا پھیلاؤ اور معاشرتی تسلط گہرا ہے۔ لیکن چونکہ سرمایہ دارانہ انفرادیت اور تعقل ایک تاریخی، حادثاتی پیداوار ہے لہٰذا اس کا وجود دائمی نہیں۔ اگر عیسائی انفرادیت سرمایہ دارانہ انفرادیت کے مختلف قالبوں میں ڈھل سکتی ہے تو سرمایہ دارانہ انفرادیت اسلامی قالب میں بھی ڈھالی جاسکتی ہے۔

یہ بنیادی طور پر ان یورپی صوفیا کی ذمہ داری ہے جو مدت دراز سے مغرب کو مشرف بہ اسلام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جیسا کہ ہمارے آقا محمد مارماڈیوک پکتھال نے فرمایا "یورپ کا مستقبل اسلام ہے"۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ صوفیائے عظام کی کوششوں کو اسلامی انقلابی عمل سے مربوط کیا جائے جیسا کہ ہمارے آقا ابو بکر نے فرانس میں تصور کیا تھا۔ یہ کرنا مشکل تو ہے ناممکن نہیں۔ کیونکہ یورپ میں مسلمان مجموعی آبادی کے تقریباً پندرہ فیصد ہیں اور ان کی نوجوان نسل میں انقلابی روح پھونکی جاسکتی ہے۔ امریکا میں سیاہ فام مسلمانوں کی بڑی تعداد موجود ہے اور وہاں اسلامی انقلاب کے نقیب ملک شہباز اور شیخ فراخان رہ چکے ہیں۔ اگر یورپ اور امریکا کے مسلمان انقلاب اسلامی کی شمع روشن کریں تو کیا عجب کہ وہاں کے مایوس، خود پرست، اکتاہٹ اور شیز وفرینا کے شکار عوام کو حیات نو میسر آجائے اور وہ تازہ دم ہو کر اٹھ کھڑے ہوں۔

وہی دیرینہ بیماری وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آب نشاط انگیز ہے ساقی

سرمایہ دارانہ نظام: ایک تعارف

(تقریظ برائے انڈین ایڈیشن)

امین اشعر

"سرمایہ دارانہ نظام: ایک تعارف" ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری کے خطبات شیخ زائد اسلامک سنٹر لاہور ہیں (خطبات لاہور از جاوید اکبر انصاری) جو انہوں نے ۲۰۰۲ میں پنجاب یونیورسٹی، شیخ زائد اسلامک سنٹر لاہور کے آڈیٹوریم میں تقریباً تین دن تک مسلسل صبح نو بجے سے تقریباً ایک بجے تک دیے تھے۔ ان خطبات میں علمائے اسلام کی ایک بہت بڑی تعداد نے بھی شرکت کی تھی۔ سرمایہ دارانہ نظام کا تعارف ایک مختصر سی کتاب ہے لیکن یہ سرمایہ دارانہ نظام کو سمجھانے کی ایک بہترین کاوش ہے جو ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری کی زندگی بھر کی علمی محنت کا نچوڑ ہے۔ الحمد اللہ ڈاکٹر صاحب ابھی بھی باحیات ہیں اور مستقل علمی و تحقیقی مواد تخلیق کر رہے ہیں۔

"سرمایہ دارانہ نظام: ایک تعارف" میں پوری سرمایہ داری کے فہم کے سمندر کو ایک کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں سرمایہ دارانہ نظام کیا ہے؟ اس کا ادراک کیوں ضروری ہے؟ اس کی ایمانیات کیا ہیں؟ کون سے نظریات ہیں جو اس کی پشت پر کھڑے ہیں اور اسے سہارا اور تقویت دے رہے ہیں؟ اس کی علمیت کیا ہے؟ اس کی انفرادیت کیا؟ اس کی معاشرت کیا ہے؟ اس کی ریاست کیا ہے؟ اس کی عالمگیر سوچ کیا ہے اور اس کا تصور خیر و شر کیا ہے؟ اس کے پیچھے کن مفکرین کی سوچ شامل ہے؟ ان تمام سوالات کے جوابات اس طرح دیے گئے ہیں کہ سرمایہ داری کی حیثیت بطور نظام و تہذیب کے واضح ہو گئی ہے۔

سرمایہ داری کے فہم کے اس کام کا سیاق و سباق غلبۂ دین کی جدوجہد فراہم کرتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ محض کوئی نظری کام نہیں ہے بلکہ غلبۂ دین کے عمل کا ایک جزو لاینفک ہے۔ سرمایہ

داری ایک عالمی تہذیب (تہذیب کا لفظ یہاں اصطلاحاً استعمال کیا گیا ہے ورنہ سرمایہ داری وحشت و جہالت ہے تہذیب نہیں ہے) ہے جو اپنی فطرت کے اعتبار سے کسی دوسری عالمی تہذیب کا وجود برداشت نہیں کر سکتی۔ اس لیے اسلام کے بطور تہذیب بقا و غلبہ کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ ہم سرمایہ داری کے خلاف عالمگیر و ہمہ گیر جدوجہد کا حصہ بنیں جس کا مقصد دین حق اسلام کا غلبہ اور شہادت حق ہو۔ ان معنوں میں سرمایہ داری کے خلاف ہماری جدوجہد غلبۂ دین کی جدوجہد اور استعمار کے خلاف جدوجہد کا حصہ ہے۔ لیکن جو چیز استعمار کے خلاف اسلامی جدوجہد کو استعمار کے خلاف دیگر کاوشوں سے ممیز و ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی جدوجہد محض سیاسی جدوجہد نہیں ہے بلکہ تہذیبی و ایمانی جدوجہد ہے جس کا بنیادی مقصد رضائے الٰہی، شہادت حق اور اخروی نجات ہے اور دنیوی غلبہ محض اس کا ایک ذریعہ ہے۔

سرمایہ داری خواہشات کی حکمرانی کا ایک ہمہ گیر نظام ہے۔ یہ حکمرانی نفس پر خواہشات کی خدائی کے قیام سے شروع ہوتی ہے اور پھر اس بنیاد پر تمام نظام معاشرت، نظام تعلیم، نظام معیشت و سیاست کو استوار کرتی ہے۔ لیکن انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے خدا کا بندہ ہے خواہشات کا بندہ نہیں اور گو کہ اس کی فطرت میں نیکی اور بدی دونوں قوتیں رکھ دی گئی ہیں لیکن وہ خود بخود خدا کی بندگی سے نکل کر نفس کی بندگی اور خواہشات کی بندگی میں آسانی سے نہیں آتا۔ خاص طور پر انسانوں کے ایک جم غفیر اور پورے کے پورے معاشروں کو خواہشات کا بندہ بنانا بغیر قوت اور جبر کے ناممکن ہے۔ اس لیے اس کا آغاز نفس پرست انسانوں کے ایک چھوٹے سے گروہ کی کوششوں سے ہوتا ہے اور یہ گروہ ریاست پر قابض ہو جاتا ہے اور اس قبضے کو استعمال کر کے انسانی معاشروں اور افراد کو خواہشات کا بندہ بنانے کا ایک مربوط سلسلہ شروع کرتا ہے۔ استعمار اور سامراجی نظام اسی سلسلے کو تمام عالم پر مسلط کرنے کا ذریعہ ہیں۔ استعمار ہی کے ذریعے پر صغیر پاک و ہند میں اسلامی تہذیب اور یہاں کی روایتی تہذیبوں کو نیست و نابود کرنے کی کوشش کی گئی اور ان کی جگہ خواہشات کی حکمرانی پر

مبنی نظام جس کو سرمایہ داری کہتے ہیں بطور زور و قوت مسلط کیا گیا۔

استعمار سے جزوی آزادی کے بعد جو ریاستیں قائم ہوئیں وہ ان معنوں میں استعمار کی باج گزار ریاستیں ہیں کہ وہ اسی عمومی فریم ورک میں رہ کر عمل کرتی ہیں جو استعماری نظام نے قائم کیا ہے اور اس کے نتیجے میں جو فرد، معاشرہ اور ریاست وجود میں آتے ہیں وہ سرمایہ دارانہ فرد، سرمایہ دارانہ معاشرے اور سرمایہ دارانہ ریاستیں ہوتے ہیں۔

آج پوری دنیا میں سرمایہ دارانہ نظاماتی تغلب قائم اور مستحکم ہے اور عوام و خواص تحکم قانون سرمایہ (rule of law of capital) کی تابع داری پر مجبور ہیں۔ یہ چیز سرمایہ دارانہ زر (capitalist money) کی عالمگیریت سے بالکل عیاں ہے۔ سرمایہ دارانہ زر سود (Capitalist money and credit) اور غرر کی تجسیم ہے اور کون ہے جو سرمایہ دارانہ زر کے استعمال سے گریز کر سکے۔ اس سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ سرمایہ داری ایک نظاماتی کلیت (systemic totality) ہے جو دھیرے دھیرے زندگی کے ہر شعبہ پر سرمایہ (یعنی وہ سرمایہ دارانہ زر جو اپنی بڑھوتری کے لیے اشیا اور اجسام سے مستقل گزرتا رہتا ہے) کو مسلط کرتی جاتی ہے۔

اوپر کی گذارشات سے دو باتیں مترشح ہوتی ہیں: ایک یہ کہ سرمایہ دارانہ استعمار کے خلاف جدوجہد ایک کلی جدوجہد ہے جو فرد معاشرے اور ریاست تینوں سطح پر برپا ہونی چاہیے اور ان تینوں سطحوں میں ربط ہونا چاہیے تاکہ ایک سطح پر جو جدوجہد ہوتی ہے وہ دوسری سطح کی جدوجہد پر منتج ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کو سمجھے بغیر اس کی انفرادی ایمانیات کو سمجھے بغیر، اس کی معاشرتی ترتیب اور عمل کو سمجھے بغیر اور اس کی ریاستی و ادارتی صف بندی اور اس کی حقیقت کو سمجھے بغیر سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف ہمہ گیر جدوجہد ناممکن ہے۔

یہ خطبات اس سلسلے کی ایک کوشش ہے تاکہ سرمایہ دارانہ انفرادیت، سرمایہ دارانہ معاشرت، سرمایہ دارانہ ریاست اور سیاست کے عمل اور ادارتی صف بندی کے بارے میں

بنیادی باتیں مخلصین دین اور علماء کرام کی خدمت میں عرض کی جائیں کیونکہ وہی استعمار کے خلاف اس جدوجہد کے اصل وارث ہیں اور انہی کی برکت سے اور انہی کی جدوجہد سے اس کام کا، جو اس وقت مختلف سطحوں پر بکھرا پڑا ہے، ایک مربوط نظام اور مضبوط قوت کے طور پر دوبارہ احیاء کیا جاسکتا ہے اور سرمایہ داری کو تینوں سطحوں پر شکست دے کر اسلامی تہذیب کو دوبارہ غالب کیا جاسکتا ہے۔

"سرمایہ دارانہ نظام: ایک تعارف" کا یہ انڈین ایڈیشن وقار احمد مُرواس (ایم پی)، متعلم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ حراء بک ڈپو لکھنؤ یوپی کی خواہش پر شائع کیا جارہا ہے، تاکہ انڈیا کے مسلمان اور ہندو، سرمایہ داری کو اچھی طرح سمجھ لیں، اور اپنی تہذیب، اپنی معاشرت اور انفرادیت کو اس عفریت سے محفوظ کرلیں۔ سرمایہ داری دنیا کی کئی تہذیبوں اور معاشرتوں کو نیست اور نابود کرچکی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ ہماری تہذیب اور تمدن اور معاشرت کو بھی ختم کردے اور ہم بس نام کے مسلمان اور ہندو رہ جائیں، جب کہ ہم اصل میں ہوں سرمایہ دار۔ اللہ اس وقت سے بچائے۔

سلسلہ رد الحاد کورسز

کورس نمبر ۲

الحادِ جدید میں انکارِ خدا کی علمیاتی اور فلسفیانہ بنیادوں (مختلف از مز) کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ

زیرِ نگرانی:

مفکرِ اسلام مفتی ابولبابہ شاہ منصور صاحب دامت برکاتہم العالیہ

تالیف و تدریس:

مولانا ندیم الرشید

منجانب: مرکز رد الحاد پاکستان

کورس آؤٹ لائن

موضوع نمبر: (1)

۱. الحادِ جدید کے تناظر میں ریشنلزم (Rationalism) یا عقلیت پرستی کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ
۲. تعارف اور فلسفیانہ پس منظر
۳. ریشنلزم کا تاریخی پس منظر
۴. عقلیت پرستی یا ریشنلزم الحاد کو کیسے بنیاد فراہم کرتے ہیں؟
۵. کیا عقل صداقت کو پانے کا واحد ذریعہ علم ہے؟
۶. عقل کے کام کرنے کا اصول
۷. عقل کا بنیادی تناظر، امام نانوتوی علیہ الرحمہ کی رائے
۸. عقل کی حدود اور خطا کا مسئلہ
۹. اگر عقل مذہب اور خیر و شر کو پرکھنے کا پیمانہ ہے تو پھر عقل کو پرکھنے کا پیمانہ کیا

ہے؟

۱۰. عقلی امور میں بھی عقل کو اپنی حد سے تجاوز کرنے کی اجازت نہیں ہے

۱۱. عقل کی محدودیت: حضرت نانوتوی علیہ الرحمہ کا کلام

۱۲. برکلے اور ہیگل کا فلسفہ / عقلی امور میں عقل کا استعمال اور خلافِ عقل نتائج

۱۳. عقل کی محدودیت اور نارسائی کانٹ کا اعتراف

۱۴. کانٹ: عقل کی ماورائے حواس دائرے میں دراندازی فکری اضداد کا سبب

۱۵. ہیگل: عقلیت کا مختلف اظہار / عام عقلیت کا بالواسطہ رد

۱۶. عقل پرستوں کے امام ڈیکارٹ کے فلسفے کا مفروضوں اور مابعد الطبیعات پر انحصار / عقل کے واحد ذریعہ علم ہونے کی نفی

۱۷. حاصلِ بحث

موضوع نمبر:(2)

۱. الحادِ جدید کے تناظر میں تجربیت پرستی (Empiricism) ایک تحقیقی و تنقیدی جائزہ

۲. فلسفیانہ تعارف اور پس منظر

۳. ایمپیرسزم الحاد کو کیسے بنیاد فراہم کرتا ہے؟

۴. ایمپیرسزم یا تجربیت پرستی کا باقاعدہ ارتقا

۵. جان لاک کے نظریے کی وضاحت

۶. برکلے کی تجربیت

۷. برکلے کی تجربیت انکارِ خدا نہیں اثباتِ خدا ہے

۸. ڈیوڈ ہیوم کی تجربیت: انکارِ خدا

۹. تجربیت پرستی کی فلسفیانہ بنیادیں

۱۰. کیا یہ فلسفہ واحد ذریعہ علم ہونے کے دعوے پر پورا اترتا ہے؟

۱۱. کیا یہ فلسفہ غیر مادی حقیقتوں کی وضاحت کر سکتا ہے؟
۱۲. کیا یہ فلسفہ قدرت کے قوانین کی وضاحت کر سکتا ہے؟
۱۳. کیا یہ فلسفہ اخلاقیات کی بنیاد فراہم کر سکتا ہے؟
۱۴. کیا ایمپیریزم ذاتِ واجب الوجود یا لامحدود علت کا مسئلہ بیان کر سکتا ہے؟
۱۵. ایمپیرسزم / ہیوم کی تجربیت کی انتہا: اپنی ذات اور کائنات تک کا انکار
۱۶. کیا یہ فلسفہ "حسیات کی ناقابلِ اعتباریت کو ختم کر سکتا ہے؟
۱۷. حاصلِ بحث

موضوع نمبر:(3)

۱. الحادِ جدید کے تناظر میں مادیت کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ
۲. مادیت کا تعارف
۳. فلسفیانہ پس منظر
۴. خدا کے انکار میں مادیت کا کردار
۵. دعوی نمبر ۱: شعور اور اخلاقیات خدا کی وجہ سے نہیں ہیں
۶. کیا ذہن و شعور مادے کا اپنا وصف ہیں؟
۷. ذہن کا اپنا مشاہدہ کرنا وجودِ خدا کی دلیل ہے
۸. ذہن کا مکان میں نہ ہونا خدا کی وجہ سے ہے
۹. شعور مادی نظامِ عضوی کے پیچیدہ تغیرات کی وجہ سے نہیں ہے
۱۰. ذاتی احساسات کا شعور خدا کی وجہ سے ہے
۱۱. دعوی نمبر ۲: خود مختار کائنات
۱۲. خدا کے بغیر کائنات کا وجود غیر معقول ہے
۱۳. فزکس کے قوانین وجود خدا کی دلیل ہیں
۱۴. کائنات اپنے آپ کو خود نہیں بنا سکتی

۱۵. جدید سائنس "نظریہ مادیت" کو رد کرتی ہے
۱۶. کیا مادیت کی بنیاد پر انکارِ خدا معقول ہے؟
۱۷. غیر مادی حقیقتوں کا انکار خود ایک تضاد ہے
۱۸. غیر مادی مظاہر کی موجودگی
۱۹. کائناتی مستقلات کی غیر معمولی ترتیب
۲۰. خیر و شر، اچھائی اور برائی کی بنیاد مادیت پر ممکن نہیں
۲۱. علت و معلول کے سلسلے کا اختتام
۲۲. شعور اور مشاہدۂ کائنات
۲۳. طبیعیات کے قوانین کی ابتدا
۲۴. نفسیاتی مظاہر کی وضاحت کی کمی
۲۵. انسانی اقدار کی عدم موجودگی
۲۶. نفسیاتی سکون کا سوال
۲۷. حاصلِ بحث

موضوع نمبر:(4)

۱. الحادِ جدید کے تناظر میں مابعد جدیدیت کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ
۲. مابعد جدیدیت کا تعارف
۳. مابعد جدیدیت کے بنیادی نظریات
۴. مابعد جدیدیت کے نئے جمالیاتی اور اقداری معیار
۵. مابعد جدیدیت کے تین بنیادی نظریات ہیں
۶. سچائی کی اضافیت کا نظریہ اور مہابیانیہ (Metanarratives) کا رد
۷. دنیا کے غیر حقیقی ہونے کا نظریہ یعنی (Hyperreality) :
۸. رد تشکیل کا نظریہ یعنی (Deconstruction) :

۹. پوسٹ ماڈرنزم الحاد کو کیسے بنیاد فراہم کرتا ہے؟
۱۰. پوسٹ ماڈرنزم کی تردید
۱۱. سچائی کی اضافیت پر پوسٹ ماڈرنسٹ فلاسفہ کا استدلال
۱۲. پوسٹ ماڈرنزم استدلال کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ
۱۳. عالمگیر مذہبی اجتماعات مہابیانیہ پر یقین کے عملی مظاہر
۱۴. حتمی سچائی کا انکار: ایک منطقی مغالطہ
۱۵. پوسٹ ماڈرنزم کے اصول، اپنے تشکیل کردہ پیمانوں سے اپنی ہی بنیادوں کا انہدام
۱۶. اگر سچائیاں انسانی سوچ کا نتیجہ ہیں تو پوسٹ ماڈرنزم بھی انسانی سوچ کا نتیجہ ہے
۱۷. عملی اعتبار سے ناقابلِ عمل فلسفہ
۱۸. پوسٹ ماڈرنزم کے ناقابلِ عمل فلسفہ ہونے پر چند عقلی مثالیں
۱۹. پوسٹ ماڈرنزم فلسفہ خاندانی نظام کو ختم کر رہا ہے
۲۰. آفاقی صداقتوں کا وجود پوسٹ ماڈرنزم کو رد کرتا ہے
۲۱. غیر حقیقی دنیا کی وضاحت، دنیا کے غیر حقیقی نظریے کو رد کرتی ہے
۲۲. پوسٹ ماڈرنزم کے نظریہ "رد تشکیل" کی بنیاد پر خود پوسٹ ماڈرنزم کی رد تشکیل
۲۳. حاصلِ بحث

موضوع نمبر: (5)

۱. الحادِ جدید کے تناظر میں سائنس پرستی کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ
۲. سائنس کی لغوی تعریف
۳. سائنس کی اصطلاحی تعریف
۴. سائنس کیسے کام کرتی ہے؟
۵. سائنس، سائنٹزم اور انکارِ خدا
۶. مفروضہ نمبر ۱: کیا سائنس سچ کو جاننے کا واحد پیمانہ ہے؟

۷. جواب
۸. معروضیت
۹. معروضیت کی حقیقت پر ہیوم کے اعتراضات
۱۰. آفاقیت
۱۱. مفروضیت سے پاک
۱۲. مفروضہ نمبر ۲: سائنس کے پاس ہمارے تمام سوالوں کے جوابات ہیں نیز کسی بھی سوال کا سب سے بہترین جواب صرف سائنس دے سکتی ہے۔ اس لیے سائنس اگر خدا کے وجود کا جواب نہیں دیتی تو اس کا مطلب ہے خدا نہیں ہے۔
۱۳. جواب
۱۴. مفروضہ نمبر ۳: سائنس حتمی، قطعی اور یقینی علم فراہم کرتی ہے
۱۵. جواب:
۱۶. استقرا: سائنسی تحقیق کا ابتدائی اصول اور بنیادی خامیاں:
۱۷. استقرا: سائنس کی غیر سائنسی بنیاد: برٹرینڈ رسل
۱۸. سائنسی مشاہدہ مفروضے کا محتاج ہے
۱۹. صرف سائنس ہی علم نہیں: علامہ اقبال
۲۰. صرف سائنس ہی علم نہیں ہے: فائن مین
۲۱. علم صرف سائنس ہی نہیں / سائنس کی غیر سائنسی زبان، ریاضی
۲۲. سائنسی تجربات غیر سائنسی عناصر پر انحصار کرتے ہیں: فیرامبیڈ
۲۳. سائنس کے قطعی، یقینی اور حقیقی علم فراہم نہ کرنے پر چند مزید دلائل
۲۴. سائنس کی عدم قطعیت ہی سائنس کے ارتقا کا باعث ہے
۲۵. سائنس حتمی یقینی علم نہیں، احتمالی یا کم و بیش یقینی علم فراہم کرتا ہے
۲۶. کسی چیز کے سائنس سے ثابت ہونے کا مطلب اس کا قطعی طور پر درست ہونا

ہر گز نہیں ہے

۲۷. حاصلِ بحث

موضوع نمبر:(6)

۱. الحادِ جدید کے تناظر میں بگ بینگ کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ
۲. بگ بینگ تھیوری کا تعارف
۳. بگ بینگ تھیوری اور ملحدین کا انکارِ خدا
۴. ملحدین کے موقف کے تضادات
۵. قانونِ علت و معلول بگ بینگ کی بنیاد پر "انکارِ خدا" کو غلط قرار دیتا ہے
۶. "کیوں" کا سوال بگ بینگ کی بنیاد پر انکار خدا کو غلط قرار دیتا ہے
۷. طبیعاتی قوانین کی بنیاد پر بگ بینگ "انکارِ خدا" کو غلط قرار دیتا ہے
۸. کائنات کی مقصدیت اور ترتیب بگ بینگ کی بنیاد پر "انکارِ خدا" کو غلط قرار دیتی ہے
۹. تجربے اور مشاہدے کے بغیر بگ بینگ پر ایمان "انکار خدا" کو غلط قرار دیتا ہے

موضوع نمبر:(7)

۱. الحادِ جدید کے تناظر میں نظریہ ارتقا کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ
۲. نظریہ ارتقا کا تعارف
۳. نظریہ ارتقا کی بنیاد پر ملحدین خدا کا انکار کیسے کرتے ہیں؟
۴. نظریہ ارتقا کی بنیاد پر ملحدین کے انکار خدا کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ
۵. بے شعور مادے سے حیات کیسے وجود میں آئی؟
۶. بے شعور مادے نے انواع اور جوڑے جوڑے کی تخصیص کیسے کی؟
۷. ارتقا نے انسانی زندگی کو مزید بہتر کیوں نہیں کیا؟

۸. ٹارڈی گریڈ میں ۵۰ کروڑ سال سے ارتقائی تبدیلی کیوں نہیں ہوئی؟
۹. انسان اور بندر نما حیوان کے درمیانی مراحل کہاں ہیں؟
۱۰. فوسل ریکارڈ کی دلیل اور جعل سازی:
۱۱. فطری چناؤ میں مسترد ہو جانے والی نسلوں کا فوسل ریکارڈ کہاں ہے؟
۱۲. ڈارونزم پر اعتراضات کا جواب، نیوڈارونزم اور اس کا نقص:
۱۳. زندگی کا آغاز ارتقا سے نہیں اچانک ہوا ہے: فوسل ریکارڈ
۱۴. ارتقاء کو مان لینے کا لازمی نتیجہ خدا کا انکار نہیں ہے
۱۵. ارتقاء نظریہ ہے یا امر واقعہ؟ سائنسدانوں کا اختلاف:
۱۶. نظریہ ارتقاء اور جدید سائنسی تحقیقات:
۱۷. حاصلِ بحث

English Section

Economic Prospects for 2025 and the Proposed Islamic Revolutionary Response

Javed Akbar Ansari

Islamic parties in Pakistan do not have a coherent economic agenda. They generally endorse a social democratic reform program without an appreciation of the capitalist context within which their social democratic reforms are inevitably situated in present day Pakistan. Thus, the social democratic economic agenda advocated by the Islamic parties if wholly or partially implemented, will provide Islamic legitimation of capitalist policies.

This paper outlines the economic prospects for 2025 so as to understand the strategy of the incumbent regime. This serves as a basis for developing some tentative proposals for challenging imperialist capitalist hegemony in the economic sphere and the development of a non-capitalist sphere of production and exchange in Pakistan by the Islamic parties.

Prospects for 2025 and the Strategy of the Incumbent Regime

FY 2024/25 can be characterized as "the year of the IMF" as far as the Pakistani economy is concerned. The IMF stooge Muhamad Aurangzeb – a citizen of Netherlands – was installed as the Minister of Finance in February 2024 and in the subsequent 9 months IMF Extended Fund Facility Program ensured the

"stabilisation" that occurred in the first half of FY 2025. This stabilisation cum structural change was affected through the issuance of IMF payment facility and debt rollovers by China and Saudi Arabia. This led to market-based exchange rate stabilisation and a large-scale interest rate reduction. Despite the current account surplus, the overall balance of payments remained in deficit however reflecting removal of restrictions on foreign profit repatriation. The inflation rate fell dramatically from 29 percent in the second half of FY 2024 to about 5 percent in the first months of FY 2025.

Thus, the economic stabilisation that occurred was entirely an imperialist backed-financial phenomenon. There was no structural change in production, gross capital formation or consumption. The incidence of poverty increased at 40 percent and unemployment – specially disguised unemployment remained high. GDP growth continues to lag behind population growth so that per capita GDP is likely to fall for the third consecutive year in June 2025. This is immiserising stabilisation – the stabilisation of the graveyard.

Immiserising stabilisation – the stabilisation of the graveyard – is likely to continue in 2025-26. In Pakistan – as in Sri Lanka – the IMF thrusts immiserising stabilisation on us to ensure that international

Shylocks continue to receive their pound of flesh – that Pakistan does not default and continues to service its debts.

But immiserising stabilisation runs out of steam. As production stagnates tax and non-tax revenue – 70 percent of which is used to service domestic and foreign debt – fall. Import liberalisation eats up the current account surplus. Energy sector circular debt balloons. Privatization stalls – as there were no foreign buyers for PIA, Pakistan Railways and Pakistan Steel. The investment strike - by both domestic firms and DFIs – continues. The IMFs projected inflows for 2025/26 are likely not to be realized. Thus, external sector financial fragility is likely to continue in 2025/26. Broadening of the tax base appears impossible. Also impossible is curtailing the debt financial share of the aggregate tax revenue.

The falling inflation rate is something of a statistical illusion. Prices rose by 29 percent in 2023-24. A further 5 percent increase in the first part of 2024-2025 is in reality no gain to the people – particularly to the poor who are disproportionately affected by the rise of food prices as shown by movements in the Sensitive Price Indicator (SPI). Moreover, Core Inflation remains significantly higher than CPI.

The stability of the Rupee depends on continued IMF support, continued debt rollovers and declining

global prices. The Rupee is expected to come under pressure due to declining debt rollover, investment, import liberalisation and removal of restrictions on foreign profit repatriation. If the Rupee depreciates the inflation rate will rise as import elasticity of domestic demand is high.

Pakistan is a typical neo-colony whose rulers depend on imperialist (American, Chinese, Saudi Arabian) support to sustain their political dominance. The immiserising stabilisation strategy has been crafted by the IMF imperialists and is being implemented on behalf of their foreign masters by the incumbent government. Moreover, a regime change – a replacement of the PML/PPP coalition by Tehreek-e-Insaf will make no difference for Tehreek-e-Insaf's "real freedom" (Haqiqi Azadi) is also imperialist subservient – after all it was the Tahreek-i-Insaaf which implemented the 2019-2022 IMF's EFF.

Immiserising stabilisation will probably fail in 2025/26 because it does not address the root cause of economic stagnation in Pakistan. This is 'stagnant factor productivity' in agriculture and manufacturing sectors in particular. This requires massive public investment in the commodity producing sectors and a check on the growth of fictitious capital – the stock and bond business and real estate. A policy to rejuvenate factor productivity growth is inconceivable within the

neoliberal policy paradigm which assumes it be a spontaneous consequence of the working of the "magic of the market". It is also inconceivable because a productivity centered growth model seeks to destroy the subordination of the domestic economy to imperialist money and capital markets. Subordination to global markets intensifies immiserising stabilisation – GDP growth during the IMF program period (2023-2027) is likely to average 2.5 per annum.

The Proposed Islamic Strategy

Islam is a complete system with a unique moral, political and economic manifestation. All Islamic groups – reformist and revolutionary – must recognize that the existence of capitalist order is incompatible with the flourishing of the Islamic way of life – Islamic social order and Islamic moral norms cannot flourish if the organization of production and exchange is structured along capitalist lines. All Islamic groups must realize that the principal objective of the Islamic economic strategy is to weaken – eventually destroy – capitalist order in Pakistan. We seek to overthrow capitalism – not to reform it.

The first step in the formulation of an Islamic economic strategy in Pakistan must therefore be the creation of a consciousness among Islamic groups to the need to reject capitalism as a socio-economic order. Current scholarship in the Islamic Economics tradition

does not address this task. Quite the contrary, Islamic Economics accepts the value premises underlying capitalist theory and practice and develops Islamic justification for capitalist transaction forms. This is especially true as far as Islamic Banking and Finance is concerned. Islamic banking and finance have contributed enormously to the absorption of Muslim wealth within riba and gharar based global money and capital markets.

The Islamic financial market, with the help of sharia advisers, provides opportunities for capitalist money to penetrate the informal Islamic sector by granting legitimacy to capitalism. Meezan Bank, Pakistan's largest Islamic bank, has experienced a significant surge in its share value, rising approximately 80% over the past year and achieving a market capitalization of $1.5 billion. This growth reflects the country's increasing shift towards Islamic capitalist finance.

Pakistan’s capitalist rulers are formally committed to the conversion of all conventional banks into Islamic banks by 2028. The State Bank is also said to be working on a formal conformance of state, domestic money market transactions with existing Sharia legitimated financing forms. There is a real danger that this fraud (invention of Sharia Compliant riba and gharar transaction forms) will ensnare more and more Muslim wealth and even Madrassahs (which have so

far not been trapped by Islamic banks) will fall victims to this system. Thus, there is an urgent need to explicate the reality of capitalist finance within Muslim countries. There is also an urgent need to develop a tamveeli system in Pakistan (see below). Islamic parties must immediately set up an expert group which puts forward a proposal for genuinely eliminating all riba and gharar equivalent transactions from the entire financial system (including those involving foreign financial transactions). This proposal may be based on the work done by the 1979 Tanzeel-ur-Rahman Commission. Dr. Shahid Hassan Siddiqui has done valuable work in this regard.

Weakening capitalism also requires rejecting imperialist surveillance of our economy. This surveillance is currently being exercised by the IMF through its ongoing EFF program. It is a matter of deep regret that no Islamic party opposed the signing of the EFF agreement in 2023 and no Islamic party is advocating its immediate repudiation today. Islamic parties lamented the rise in utility prices, the growing commodity prices, the growing unemployment and depression, the exorbitant indirect taxes. But no Islamic party points out that all this is due to the imposition of the IMF's EFF agreement. No Islamic party calls for the repudiation of this program. No Islamic party calls for an immediate imposition of a

debt repayment moratorium. No Islamic party opposes trade liberalisation, unrestricted capital outflows, exchange rate marketisation, sale of government enterprises to domestic and foreign capitalists.

The Islamic parties fail to realize that the theory underlying these policies is false – these policies can result only in accelerated immiserisation.

Similarly, Islamic parties and groups lament American crimes in Palestine but no Islamic party has the guts to call for expulsion of the American ambassador, the closure of its financial program, for the imposition of a trade boycott of American imports and American franchises in Pakistan.

Islamic parties and groups must through agitation and election exert pressure on the incumbent political elite and the state to repudiate the IMF program, abandon the neoliberal policy paradigm, declare a debt moratorium, stand up to American imperialism. Given our political weakness, success achieved will necessarily be limited but as the recent Madrassah legislation struggle has demonstrated, the capitalist grip on the national economy can be loosened even if only marginally through a direct political action.

Our political weakness exists because of the fragmentation and disorganization of our basic political constituency. Our basic political constituency

consists of mukhliseen-e-deen who in their personal lives try to adhere to the commandments of the Shariah. They are the mukhlisin-e-deen and according to a conservative estimate in 2018 they constituted about 25 million people. This is by far the largest popular constituency of any ideological group in Pakistan. But our basic constituency (the mukhlisin-e-deen) are both reconciled to their powerlessness and disorganization. In the struggle against capitalism, the principal task of the Islamic parties and groups is the empowerment and organization of the mukhlisin-e-deen and consolidation of their leadership over the 'awam'.

Islamic parties and groups must unite and create a nation-wide network of mosques and the leadership of local mukhlisin-e-deen which should serve as the nucleus of a gradually emerging non-capitalist economy in Pakistan. An informal non-capitalist economy already exists in Pakistan where the majority of informal enterprises have no links with the money and capital markets and are not within the tax net of the government. A tamveeli system can be organized by an Islamic party on this basis along the following lines:

a. The Islamic group (say the Tableeghi Jamaat) gathers the savings of the community through the mosque network.
b. The Tableeghi Jamaat identifies from its

members businesses which can utilize extra investment.

c. The Tableeghi Jamaat arranges investment of funds in the business on a musharaka, modaraba and ijara bases.
d. The Tableeghi Jamaat takes the responsibility of transference of funds from surplus areas to areas where preferable investment exists but halal funds are not available.
e. The Tableeghi Jamaat monitors repayment schedules.
f. The Tableeghi Jamaat acts as a quasi-public sector agency taking no share of the profit accrued by the investment but administration expenses may be collected.

As the tamveeli network spreads local infrastructure projects can also be financed and local communities' capacity to meet public resources needs – water, power, communication – will be enhanced. Instead of agitating for the provision of the service through the capitalist policy framework, the Islamic parties and groups will enhance the capacities of the communities to service their needs on a non-capitalist basis.

A principal concern of creating and operating a non-capitalist economy is the replacement of hirs (حرص) and hasad (حسد) by sabr (صبر), tawakkul (توکل) and infaq (انفاق) as motives for investment, saving, consumption and production. Since the investors in

the above tamveeli scheme will be members of the Tableeghi Jamaat, the Tableeghi Jamaat will develop a program for inculcating the virtues of sabr, tawakkul and infaq and discouraging the growth of hirs and hasad among its savers and investors.

State level political activity by the Islamic parties will be focused on strengthening and expanding the operational ambit of this nation-wide network of mosques and gradually a non-capitalist economy will emerge and the power and authority of the mukhliseen-e-deen will be gradually increased.

Summary of Proposal for Islamic Parties in 2025 and 2026

1. Immediately launch a nationwide campaign for the termination of the IMF's ongoing ESAF program.
2. Immediately initiate a movement for the moratorium on the payment of foreign debt linking repayments per year to foreign exchange earnings. Unilaterally cancel all foreign interest rate payment obligations and start negotiations for restructuring of foreign principal debt obligations specially with the IMF.
3. Advocate conversion of domestic public debt obligations in accordance with genuine Islamic transaction forms.
4. In early 2026 and throughout 2026 and 2027, launch a nationwide campaign to oppose the

formal conversion of the conventional haram banking system into a nominal Islamic banking system.

5. During 2025 prepare a comprehensive plan – based on the 1979 Tanzeel-ur-Rahman Report – of converting the conventional haram financial system into a genuine Islamic transaction (tamveeli) system. This would consist of:
    a. The de-commodification of money
    b. The nationalization of all financial institutions in the country
    c. The termination of all money and capital account speculative transaction forms.
    d. Complete delinking from global money and capital markets
6. Imposition of strict capital controls specially on the repatriation of profits by companies in the form of foreign exchange.
7. Initiation of direct collaboration with trade union movements in the country so that a full-scale movement against privatization of state-owned enterprises could be launched as soon as possible. Privatization is the principal means for subjecting the economy to imperialist markets and for the conversion of a national economy into a full-fledged capitalist economy. Islamic parties must oppose privatization with all the forces at their command throughout 2025 and 2026.
8. Propositions must be articulated by Islamic

parties and groups for the launch in 2026 operated under mosque based tamveeli system in which savings of Islamic workers are collected for the growth of profitable Islamic businesses under the supervision and guidance of Islamic groups willing to serve as quasi-public sector organization. The sooner we set up this tamveeli network the nearer we will come to establishing a non-capitalist economy producing halal rizq and giving opportunities to the mukhlisin-e-deen.

9. The principal cause of Pakistan's economic backwardness and structural stagnation is decline in factor productivity. This requires particularly the growth in public investment in the commodity producing sectors (basically agriculture and industry). Such investment totally disappeared in the mid-1980s. Islamic parties must agitate for a reversal of public investment in major manufacturing sectors – steel, transportation, chemicals, aluminum, mining – instead of passively handing over them to private enterprises. We must also agitate to ensure that incentives are provided for the investment rather than the mere consumption of funds provided in the income support programs (BISP etc.)

On Possibility of Revolution: Islamic versus Marxist critiques of Capitalist Order

Dr. Syed Z. Arshad

The following commentary introduces German philosopher Byung-Chul Han and Italian philosopher Antonio Negri – focusing on their critiques of capitalism (i.e. a capitalist ideology based on the system of private ownership). At an event in 2014, Negri presented himself as a Communist revolutionary, enthusiastic about global resistance to the "Empire" (i.e. the neoliberal system of domination) and criticized Han for his skepticism towards revolution (against the Empire). In response, Han wrote a short piece, "*Why Revolution is No Longer Possible?*" [1], defending his point of view about why, he thinks, such a revolution is no longer possible.

This commentary will explore (a) Negri's conception of Empire and how he conceives the possibility of revolution through 'Multitude' (rather than the traditional *proletariat* class), (b) Han's critique of Negri's optimism and why he believes that the *seductive* system-preserving powers make a communist revolution impossible, and will then (c) differentiate between an Islamic critique and a Marxist critique of Capitalist Order. It will conclude that

[1] English trans. published online in 2015 at OpenDemocracy.Net https://www.opendemocracy.net/en/transformation/why-revolution-is-no-longer-possible/

Islamic revolution will always remain a possibility.

Who are Byung-Chul Han & Antonio Negri?

Byung-Chul Han (b. 1959) is a South Korean-born German philosopher known for his critiques of contemporary capitalist societies, focusing on themes like power, digital surveillance, and the decline of communal life. Educated in Germany, Han draws on diverse influences, from Heidegger to Foucault, and explores how neoliberalism manipulates individuals through self-exploitation, digital control, and consumer culture. His works, including *The Burnout Society (2010)* and *Psychopolitics: Neoliberalism and New Technologies of Power (2014)*, examine how modern life produces alienation, burnout, and the erosion of genuine human connection. Han teaches philosophy and cultural studies at Berlin's University of the Arts (UdK). He is author of several best-sellers and continues to meticulously dissect the anxieties produced by neoliberal capitalism. His other famous books include, *The Expulsion of the Other (2018)* and more recently *The Crisis of Narration (2024)*.

Antonio Negri (d. 2023) was an Italian Marxist philosopher, political theorist, and activist known for his work on labour, power and global capitalism. A central figure in the autonomist Marxist movement, Negri co-authored *Empire (2000)* with Michael Hardt, in which they argue that traditional nation-state power

has given way to a decentralized global sovereignty. His work focuses on how power structures adapt and how the *Multitude (2004)* — a diverse collective of people — can resist capitalist domination and seek liberation. Negri has been a significant voice in postmodern political thought. Hardt & Negri's trilogy - *Empire* (2000), *Multitude: War & Democracy in the Age of the Empire* (2004), and *Commonwealth* (2009) is considered by many to be the new Communist Manifesto.

(A) Hardt and Negri's conception of "Empire" and how they conceive of the possibility of revolution through "Multitude"

Michael Hardt and Antonio Negri use the term "Empire" to describe a new global form of sovereignty that differs from traditional nation-state-based imperialism. Rather than a single state or national power (like the historical empires of Britain, Rome, or the U.S.), "Empire" refers to a decentralized and multifaceted system of global governance and control that transcends individual nation-states. This system is composed of international institutions, multinational corporations, financial markets and transnational political structures.

As per Hardt & Negri (2000 & 2019) key features of the "Empire" include:

1. **Decentralization**: It is not controlled by a single state

or actor, but is maintained by a network of transnational institutions (such as the United Nations, the World Bank and the International Monetary Fund), multinational corporations and global capital.

2. **Global Reach**: "Empire" operates on a planetary scale, exerting influence through political, economic, cultural and military means.

3. **Mixed Constitution**: Borrowing from the Roman concept of a "mixed constitution," Hardt and Negri argue that "Empire" includes multiple forms of governance—monarchical (dominated by powerful states like the U.S.), aristocratic (dominated by elites and corporations) and democratic (represented by the broader mass of people, although limited in scope and power).

4. **Supranational Governance**: As the power of national sovereignty fades, transnational regimes like the European Union, global trade agreements, and other supranational bodies exert more control, shaping governance in ways that supersede individual state authority.

5. **Continuous Crisis Management**: Rather than being threatened by crises, "Empire" thrives on crisis. It manages global economic and social conflicts to maintain its rule. The system adapts to disruptions, such as financial crises or social revolts, by absorbing them without fundamentally altering its power

structures.

In essence, the "Empire" is a metaphor for the globalized power system that transcends traditional borders and operates through economic, political, and cultural domination on a worldwide scale.

The concept of **Multitude** in Michael Hardt and Antonio Negri (2004) refers to a diverse, decentralized collective of individuals who are united not by identity (such as nationality or class) but by their shared condition under global capitalism and the structures of "Empire". Unlike traditional notions of the "people" or "proletariat," which imply a unified or homogeneous mass, "Multitude" emphasizes *multiplicity* and *diversity*.

Following is a breakdown of the key characteristics of "Multitude",

1. **Diversity and Multiplicity**: The Multitude is composed of diverse social groups, individuals, and movements that maintain their distinct identities (such as race, gender, class, nationality, etc.) but are united in their opposition to the forces of the Empire. This stands in contrast to the concept of a singular "people," which often implies uniformity.
2. **Decentralized**: The 'Multitude' does not have a single leader, central organization, or homogeneous structure. Instead, it operates through networked, decentralized cooperation, much like how the Empire

itself is decentralized. This is often seen in social movements where there is no single leader, but collective actions emerge through shared ideas and goals.

3. **Productive Power**: The 'Multitude' is also a creative and productive force, capable of generating social, political, and economic alternatives. Hardt and Negri argue that within capitalist production, it is the cooperation, creativity, and social interaction of people that drive economic value. Therefore, this collective productivity holds the seeds of a new social order.

Revolution through the Multitude

Revolution, according to Hardt and Negri, can emerge from the 'Multitude' through its capacity to resist the structures of 'Empire' and create alternative forms of social organization. This revolution is based not on seizing state power in the traditional sense (as in classic Marxist revolutions), but rather on building networks of resistance and cooperation that subvert 'Empire' from within.

Key aspects of '*Revolution through Multitude*' include:

Networked Resistance: The 'Multitude' operates through decentralized networks that can organize spontaneous and widespread forms of resistance against the 'Empire'. These networks can be seen in global movements like anti-globalization protests,

Occupy movements, and transnational solidarity efforts. These forms of resistance are hard for the Empire to control because they lack any central point of weakness.

Creation of the Commons: Hardt and Negri see the 'Multitude' as capable of reclaiming and expanding the "commons"—shared resources like knowledge, social cooperation, and even the environment—that have been appropriated by capitalism and 'Empire'. By creating and managing the commons autonomously, the 'Multitude' builds an alternative to the privatized and commodified structures of 'Empire'.

Immanent Power: The Multitude's power comes from within the structures of Empire itself, as the multitude itself constitutes the social cooperation, labour, and communication networks that the global capitalist system depends on. By recognizing its own power and organizing around shared goals, the Multitude can undermine the systems of control and create new forms of democratic and equitable social relations.

Revolution as Process, Not an Event: For Hardt and Negri, revolution is not a single event like the storming of a palace or the overthrow of a government. Instead, it is a continuous process of building new forms of social organization from below, through the decentralized and creative activity of the 'Multitude'.

This revolution is ongoing and operates within the cracks and crises of 'Empire'.

In short, the 'Multitude' represents a new form of collective subjectivity that is capable of organizing a revolution *from within global capitalism* by leveraging its productive, networked, and decentralized nature. Rather than seizing control of a state apparatus, it aims to create alternative forms of life, governance, and production that challenge and will eventually replace the structures of 'Empire'.

Framework for change through Multitude

It may be argued that this approach reflects a shift from *violent* overthrow to a gradual creation of new self-sustaining systems - perhaps, one may call it a *soft* revolution rather than the violent one. *Multitude* focuses more on the *potential* of decentralized, networked, and productive collective action rather than laying out detailed, step-by-step instructions for building alternative forms of life and governance. However, they do outline general principles and strategies that could guide such a transformation. These principles, though not prescriptive, point to how new forms of governance and life might emerge to challenge and replace the structures of the *Empire*.

Following are the six key ideas that provide a framework for this process:

1. Autonomous Creation of the Commons:

- **What it means**: The 'commons' refer to shared resources — whether material (like land and water) or immaterial (like knowledge and communication networks) — that are collectively managed for the benefit of all, rather than controlled by private interests or state power.
- **How it challenges capitalism**: By reclaiming and expanding the commons, the *Multitude* can undermine capitalist privatization and commodification. This process involves creating cooperative forms of production, community-based resource management, and sharing knowledge freely rather than for profit. This could happen through:
    - Digital platforms for open-source collaboration.
    - Cooperatives that produce goods and services outside capitalist markets.
    - Community land trusts or local governance that prioritize shared, sustainable use of resources.

2. Horizontal, Networked Governance:

- **What it means**: The *Multitude* is characterized by decentralized, non-hierarchical forms of organization. This kind of governance focuses on participation, inclusiveness, and cooperation, avoiding top-down control.

- **How it challenges capitalism**: In contrast to the hierarchical structures of states and corporations, networked governance would empower local communities and groups to self-organize without the need for centralized power. This could manifest through:
    - Community councils or assemblies where decisions are made democratically.
    - Platforms that allow for decentralized decision-making in economic or political matters, akin to how some blockchain technologies operate.
    - Grassroots political movements that seek to implement local forms of governance that challenge state power.

3. Decentralized Economic Structures:

- **What it means**: Negri and Hardt suggest that economic production could be reorganized around cooperative, non-exploitative principles where workers control the means of production and the wealth generated is shared equitably.
- **How it challenges capitalism**: By rejecting profit-driven production and exploitation, these economic structures would replace capitalist corporations with cooperatives or communal ownership. Examples include:
    - Worker-owned cooperatives where profits are distributed equally or reinvested in the community.

- Peer-to-peer production models that bypass corporate control (e.g., free software movements or locally run energy grids).
- The use of non-monetary exchange systems like time banks or local currencies that challenge capitalist market structures.

4. Global Solidarity and Interconnected Movements:

- **What it means**: The *Multitude* operates on a global scale, recognizing that resistance must be interconnected across borders to counter the global reach of the *Empire*. It focuses on solidarity among diverse movements (e.g., labour, environmental, feminist, and anti-colonial).
- **How it challenges capitalism**: By building networks of solidarity, the *Multitude* can coordinate actions globally, create shared resources, and develop unified strategies that transcend national boundaries. This could be realized through:
  - Transnational advocacy networks that share resources and strategies for local struggles.
  - Global movements like Occupy or climate justice that focus on common global issues (e.g., inequality, environmental destruction) while maintaining local autonomy.

- Digital platforms that facilitate global collaboration and the sharing of resources across movements.

5. Social Production of Knowledge and Culture:

- **What it means**: The *Multitude* challenges capitalist commodification of knowledge and culture by emphasizing free exchange and collective creation. Intellectual property, in this view, should be open to all.
- **How it challenges capitalism**: Rather than privatizing knowledge (e.g., through patents, copyrights), social production emphasizes open-access resources. This could take the form of:
  - Open-source software and creative commons licensing that allow knowledge to be freely shared and developed.
  - Cooperative cultural production that bypasses capitalist media conglomerates.
  - Educational systems or platforms that offer free, collective learning and knowledge sharing.

6. Resistance through Crisis and Subversion:

- **What it means**: The *Empire* is seen as thriving on crises, but crises also present opportunities for the *Multitude* to subvert the system and create new forms of organization.

- **How it challenges capitalism**: During times of economic, social, or environmental crises, the *Multitude* can step in to create alternative structures. For example:
    - Local community mutual aid networks that step in to provide services when the state fails (as seen during economic downturns or environmental disasters).
    - Occupations of public spaces or resources (e.g., land occupations, housing takeovers) to reclaim commons from private control.

Following are some challenges and open questions as Negri and Hardt's framework is more of a theoretical blueprint than a practical roadmap. Some challenges to this vision include:

- **Scalability**: Can decentralized, cooperative models scale effectively to replace large-scale capitalist structures?
- **Sustainability**: How will these alternatives sustain themselves long-term in the face of powerful capitalist systems and states?
- **Resistance to Co-optation**: How can these movements avoid being co-opted or absorbed back into the capitalist system, as has happened with some elements of the "sharing economy"?

In summary, while Negri and Hardt do not provide a detailed step-by-step guide for building alternative forms of life and governance, they offer a conceptual framework where the *Multitude* leverages

decentralized, networked, and cooperative models to challenge the structures of the *Empire*. This revolution would not be about capturing state power but about building new, autonomous forms of governance, production, and life that will gradually replace capitalism from within.

(B) Han's critique of Negri and why he believes that a Revolution is impossible

Byung-Chul Han critiques Antonio Negri's revolutionary optimism by arguing that the conditions for revolution no longer exist under neoliberal capitalism. While Negri sees the **Multitude** as a potential force for overthrowing the **Empire**, Han contends that the nature of *power* has changed. In contrast to the ***repressive*** power of earlier systems, neoliberalism ***seduces*** individuals into *self-exploitation*. People become "entrepreneurs of the self" - internalizing class struggle and directing aggression inward - which Han argues makes collective resistance and revolution impossible.

Han's Key Points:

1. **Neoliberal Seduction**: Power today does not *repress* but *seduces*, making individuals voluntarily comply with their own subjugation. Unlike traditional capitalism, where a clear oppressor and oppressed existed, neoliberalism blurs these lines by turning workers into self-exploiters. This transforms the class struggle into an internal, individual conflict, making collective solidarity difficult.
2. **Self-Exploitation**: Han argues that in neoliberalism,

everyone becomes both master and slave—an "entrepreneur of the self". The oppressed now blame *themselves* for their failures rather than the system. This inward-directed frustration (burnout, depression) replaces outward-directed resistance - neutralizing the possibility of revolutionary action.

3. **Isolation and Competition**: Neoliberalism fosters *extreme* individualism and competition - even within the same enterprise. Unlike industrial capitalism, where workers could form solidarity against factory owners, today's system pits *everyone* against one another - eroding any communal revolutionary potential. The competitive, isolated nature of this system makes it hard to form a unified, revolutionary mass like Negri's Multitude.

4. **Burnout and Exhaustion**: Han also argues that burnout and exhaustion, widespread in today's work culture, are incompatible with revolutionary energy. Neoliberalism drains individuals through overwork and constant self-optimization, leaving no space for collective revolt.

5. **Sharing Economy and Commodification**: Han also critiques the so-called "sharing economy," which he sees as further entrenching neoliberal logic. He argues that platforms like Airbnb and Uber commodify aspects of life that should remain outside capitalist exchange, leading not to communism, as some suggest, but to further commercialization. Even community and sharing become capitalist tools - neutralizing the potential for radical transformation.

Byung-Chul Han argues that the so-called "sharing economy," often presented as a form of communal exchange - actually extends capitalist logic. Even activities like sharing or community-based services are commercialized, driven by profit rather than genuine altruism. Han claims that capitalism "sells communism as a commodity" - meaning it packages and commodifies ideals of sharing and community for profit. This represents the ultimate fulfillment of capitalism - where even revolutionary or anti-capitalist ideas (like sharing or communism) are absorbed into the capitalist framework, neutralizing any revolutionary potential.

In essence, Han argues that revolution is impossible today because neoliberalism has dissolved traditional forms of resistance - replacing them with a system that uses freedom and individual responsibility to perpetuate domination.

(C) Differences between Islamic critique and Marxist critique of Capitalist Order

Islamic and Marxist critiques of capitalism both appear to challenge the exploitative and hegemonic nature of the capitalist order but in reality differ fundamentally in their underlying philosophy, objectives and outcomes. In essence, Marxist efforts, aim to replace free-market capitalist ideology based on a system of private ownership with a more egalitarian state sponsored capitalism (that would prioritize freedoms of collectives over freedoms of individuals). The purpose here seems to be a more equitable

distribution of resources and a better 'collective' realization of Humanist ideals of Freedom, Equality and Progress (enabling Mankind to *truly* become God in themselves). Whereas Islamic efforts aim to uproot the entire capitalist order (along with its *jahili (*جاهلي*)* values of Freedom, Equality and Progress) and replace it with the Deen of Islam. (The word 'Deen' here implies an active Islamic way of life at all levels of existence viz. individual, society and state). Man is not a 'Human' but an *abd (*عبد*)* of Allah SWT. The purpose here is not just to individually earn the pleasure of Allah SWT but to design, enable and maintain a framework for all to earn the pleasure of Allah SWT.

1. Concept of Man and Purpose

(i) **Marxist Perspective**: Marxism views man as a primarily material being shaped by their socio-economic conditions. The goal of Marxist revolution is to free mankind from exploitation so they can fully realize themselves through economic equality and control over production. Marxism focuses on material fulfillment and believes human progress is driven by historical class struggle.

(ii) **Islamic Perspective**: In Islam, man is not just a material being but is seen as a servant **of Allah** (ʿabd). Primary purpose of man is to worship and obey Allah SWT, as the Qur'an states: *"I did not create the jinn and mankind except to worship Me."* (Qur'an, 51:56). Success of a Man is measured by adherence to divine guidance, not material achievement. Thus, the goal of Islamic revolution is to create a society where worship and

submission to Allah are facilitated and natural.

2. Source of Knowledge and Guidance

(i) **Marxism** is based on **materialist philosophy** and **human reason**. Marxism claims that all socio-economic systems, including capitalism, are products of historical development, and its solutions are derived from human analysis of material conditions.

(ii) **Islam** derives its understanding of society, economics, and governance from **divine revelation** (Qur'an and Sunnah). Islam views man's intellect as limited and believes that true justice can only be established by following the divine laws revealed by Allah SWT. It sees the Marxist reliance on human intellect alone as flawed because it completely ignores the spiritual and moral dimensions.

3. View on Morality

(i) **Marxism -** like the rest of worldly 'isms' - offers no **morality** from a spiritual or religious standpoint. Morality here refers to the 'hierarchical ordering of desires'. All individual desires of man are given equal value (for example, anyone's desire to count the blades of grass is considered no better or worse than anyone's desire to eradicate drug cartels or even to pray). Marxism simply considers the capitalist system as unjust primarily because it is a system based on private ownership that results in material inequality - but it does not have any universal moral framework beyond class struggle and collective equality.

(ii) **Islam's** conception of morality is central to the Islamic critique of capitalism. Capitalism is not just

rejected for its economic exploitation but also for its moral bankruptcy, domineering greed and selfishness, and the relentless pursuit of accumulation for the sake of accumulation. Islam emphasizes accountability to Allah SWT, compassion to mankind and justice (ʿadl) in the public sphere - which leads to a system of ethics that governs all aspects of life and relationships. Not all desires are the same. Individual desires are to be ordered by God-consciousness and piety (taqwa). Like Allah SWT says in Surah Al-Hujurat "... Indeed, the most noble of you in the sight of Allah is the most righteous of you …" (Qur'an, 49:13).

4. Capitalist Order is not a historical necessity but an unfortunate deviation

(i) **Marxist critique presumes Historical (and Dialectical) Materialism**: Marxism critiques capitalism as an exploitative private ownership system based on class struggle - where the bourgeoisie (capital owners) oppresses the proletariat (workers). It focuses on the material conditions of life and economic determinism - believing that the economic base shapes societal structures. This view of history is derived from Hegel's conception of Geist realizing itself in time - by going through several stages of insights into itself (or as interpreted by Fichte, through thesis, anti-thesis that leads to the new synthesis). However, as per Marx, Hegel's Idealism left his dialectic "standing on its head. It must be turned right side up again". Thus, Marx focused on the changing 'material' modes of production that give rise to the new relations of

production (i.e. the material conditions of life) and argued capitalism to be a historical necessity.

(ii) **Islamic Critique is ahistorical:** The basis of Islamic critique is divine revelation (i.e. the Quran and Sunnah which are the source of true knowledge/guidance for all mankind and for all times to come). Islam does not regard Capitalism to be a historical necessity - rather Capitalist Order is a historical anomaly. An unfortunate deviation due to uncontrolled avarice and greed based collective decisions of Christian rulers and Church. Christendom after centuries of corruption and colonial exploitation evolved into the secular Europe that we see today). As per Islam, the first Man (Adam AS) began life with complete knowledge and guidance from Allah SWT. Then, over time, a long line of Prophets and Messengers (peace and blessings be upon them) were sent - everytime Mankind deviated from the correct path. Now that the Last Messenger Mohammad ﷺ has been sent - the only correct guidance is that of Holy Quran & Sunnah of the Prophet ﷺ. Islamic critiques, following in the footsteps of Imam Al Ghazali, aim to demonstrate the theoretical absurdity (i.e. jahiliya) and the catastrophic practical consequences of pursuing non-revelationary based systems. Furthermore, they argue for and provide theoretical support to various Islamic movements for the re-establishment of Islam as a Deen.

5. Economic Vision and Redistribution

(i) **Marxism** seeks to abolish private property and

create a classless society where wealth is redistributed according to need. The focus is on **economic equality** and the control of the means of production by the working class or collective.

(ii) **Islam** recognizes the right to private property but mandates its use in a way that benefits society. It emphasizes **zakat** (obligatory almsgiving), **sadaqah** (charity) and other ethical business practices to ensure a fair distribution of wealth. Islam prevents large accumulations of wealth circulating in the hands of the few. While Islam acknowledges the existence of economic classes, it aims to reduce extreme inequalities and promote social welfare through divine obligations, not through forced redistribution. As per **Surah Al-Hashr** "Whatever Allah has restored to His Messenger from the people of the towns—it is for Allah and for the Messenger and for [his] near relatives and orphans and the needy and the [stranded] traveler—**so that it will not be a perpetual distribution among the rich from among you**. And whatever the Messenger has given you—take; and what he has forbidden you—refrain from. And fear Allah; indeed, Allah is severe in penalty." *(Qur'an, 59:7).* This verse emphasizes that wealth and resources should be distributed in a way that benefits the entire community, especially the vulnerable, and should not remain in the hands of the wealthy elite alone. It establishes principles of social justice in Islam.

6. Views on Freedom

(i) **Marxism** seeks to maximize **human freedom** by

freeing individuals from economic oppression, allowing them to control their own labour and live without class-based exploitation.

(ii) **Islam** also advocates for justice and freedom from oppression, but Islam defines **freedom** differently. In Islam, Freedom is a resource (to be used for earning the pleasure of Allah SWT) and not a value (that needs to be maximized - as assumed by capitalist order). True freedom would be freedom from enslavement to worldly desires and false gods (ṭāghūt) which would include the materialist and secular ideals that capitalism represents. A Muslim is only free when they are a servant of Allah - submitting to the Divine will.

7. Views on Progress and Equality

(i) **Marxism**: Holds the ideals of **progress** and **equality** as central, seeking to create a society where human development can proceed unhindered by class divisions.

(ii) **Islam**: Rejects the secular concepts of progress and equality that are divorced from divine purpose. While Islam acknowledges the importance of progress, it is progress according to Allah's guidance, not humanist ideals. **Equality**, in Islam, does not mean erasing all distinctions but ensuring that all are equal in their responsibility to worship Allah and are treated justly in accordance with divine law.

8. View on Revolution

(i) **In Marxism,** revolution is seen as a necessary, historical process driven by material conditions and class conflict. It often envisions violent overthrow of

the capitalist class, though later Marxists like Negri propose a more gradual, decentralized change.

(ii) **Islam** views revolution as a spiritual obligation whenever the Deen of Islam is not being implemented or dominant. Considering history and the context, the process may or may not be violent, depending on the nature of rebellion (taghut). However, it is the process of reestablishing divine laws at all levels of society (individual, social, and state). The revolution in Islam is holistic, addressing not only economic structures but also spiritual, ethical, and legal systems.

9. Agency of struggle against the Capitalist Order

(i) **Marxist Critique Expects a Class Revolution**: Marxists understand and advocate for the overthrow of capitalist structures through class struggle. According to classical Marxism, workers first become conscious of sharing common grievances against capitalists (thus forming a class "in-itself") and eventually develop an awareness of themselves as forming a social class opposed to the bourgeoisie (thus becoming a class "for-itself") - the proletariat. It is this fully aware proletariat that is expected to be the vanguard of revolution - leading to the establishment of a classless, communist society where wealth is distributed according to need and not private ownership. Hardt & Negri's conceptualisation replaces the proletariat with the Multitude (as discussed in earlier section). The key motivator here is the reaction to excessive exploitation and repression by the capitalist structures of domination.

(ii) The Islamic critique looks at Capitalist Order as a rebellion (طاغوت) against Allah SWT. Capitalist Order aims to turn every Man into an autonomous and self-sufficient 'god' (i.e. a Human Being). This Human Being (in practice) is nothing but a slave of his own desires (أَهْوَاء) who is continuously trying to maximize accumulation. Capitalist Order is characterized by a 'spirituality' of avarice and covetousness. Its kalima is لا إله إلا الإنسان ('there is no god but man'). Islamic critique rejects and aims to delegitimize the Capitalist values of freedom, equality and progress. It provides a definitive critique of various ideologies of capitalist order (including Marxism/Socialism). Islamic critique prefers the orthodox approach and considers the various revisionist and modernist approaches to Islam as slippery slopes that will ultimately serve to incorporate Islam within the Capitalist Order. This Islamic critique provides theoretical support to the various Mujahideen groups struggling to advance Deen of Islam. These Mujahideen are the vanguard of Islamic revolution. They must aim to unite the *Mukhliseen-e-Deen* (مخلصین دین) and develop social institutions that will make the practicing Deen of Islam convenient and natural at both individual and social level. The Mujahideen aim to establish the Islamic State that will take the message of Islam to all corners of the world.

10. Motivation for Overcoming Capitalism through Revolution:

(i) Marxist Revolution? or Not?: Traditional Marxist critiques envisaged a violent revolution led by the proletariat class. But Hardt and Negri replaced the proletariat class with Multitude. Also their vision of change is no longer violent - but rather a soft revolution that aims to bring about a gradual change from within capitalist order. On the other hand, Han simply does not envisage any change in capitalist order. However, if we are to consider power as being more seductive rather than repressive - then perhaps the so-called 'change' might be far too slow to be effectively called a revolution in any practical sense. For some commentators, the revolution, by no longer being violent, simply does not deserve to be called a revolution. Most people living under the yoke of capitalist order don't appear willing to sacrifice their existing material comforts for a higher cause.

(ii) Whenever Islam is not the dominant Deen, there is a need for a Revolution: Motivation of Islamic critique and the Mujahideen is very different. Original Islam must be preserved at all cost. Revisionist and Modernist approaches to Islam are a compromise - to save Muslim communities from oppression and material losses - but will over time result in Islam being incorporated within capitalist order just like Judaism, Christianity and more recently Hinduism. Modernist approach to Islam outrightly accepts the Capitalist Values of Freedom, Equality and Progress whereas Revisionist approach tries to give an Islamic justification for the same values e.g. in the form of

Islamic Banking, Islamic Finance, Islamic Republic etc. Only the Orthodox approach to Islam can be the true savior of original Islam. In such a case, revolution remains the only way forward. The path of the grandson of Prophet (ﷺ) Imam Husain bin Ali (RA).

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن

(Martyrdom is the desired and ultimate goal of a believer)

نہ مالِ غنیمت ، نہ کشور کشائی

(Neither the wealth of spoils nor the conquest of kingdoms)

Conclusion

In summary, while both Marxism and Islam critique capitalism, they do so from fundamentally different perspectives based on diametrically opposed worldviews. Marxism is a **materialist**, secular philosophy focused on class struggle, whereas Islam is a **holistic** way of life that emphasizes submission to Allah and moral conduct in all aspects of life. These differences in worldview, objectives, and methodology make the Islamic critique much broader and spiritually grounded compared to the materialist focus of Marxism.

Furthermore, the inevitability of revolution is an undeniable reality, for history has never been static, nor has any oppressive system endured indefinitely. While capitalist apologists—from Hegel to Rorty and Habermas—have relentlessly sought to portray the global capitalist order as a necessary and inescapable reality, their arguments, though outdated, continue to exert influence. Unfortunately, even some Islamic scholars appear affected by these narratives, viewing the permanence of the capitalist order as an

unalterable fate. However, such conclusions stand in stark contrast to the unfolding realities of our time.

Byung-Chul Han, following in the footsteps of post-Marxist thinkers like Deleuze and Guattari, argues that a revolutionary transformation is impossible today. He presents capitalism as an all-encompassing and seductive force, one that no longer relies on overt repression but rather on voluntary compliance and self-exploitation. He posits that the proletariat no longer exists as a unified class, that individuals have become willing participants in their own subjugation, and that capitalism's hold over societies has become too deeply entrenched to be overturned. However, such a perspective is fundamentally Eurocentric, reflecting only the realities of a post-industrial Western world while remaining oblivious to the revolutionary fervor sweeping across the Muslim world.

Far from being obsolete, Islamic revolution remains an active and ongoing force. The past half-century has seen the triumph of Islamic movements, with the Islamic Revolutions in Iran and Afghanistan standing as towering examples of resistance against global capitalism and imperialism. Despite relentless efforts by global powers to neutralize these movements, they remain resilient, demonstrating that an alternative to capitalist hegemony is not only possible but inevitable. The enduring struggles of resistance movements in Palestine, Chad, Burkina Faso, Mali, Lebanon, Yemen, and Central Africa further reinforce the reality that the global capitalist order is not unchallenged—it is, in

fact, besieged from multiple fronts.

The Islamic critique of capitalism is not merely an economic or social theory; it is a call to restore divine order in a world plunged into chaos by secular materialism. Unlike Marxism, which seeks to replace capitalism with a classless economic structure, Islam rejects the very foundations of capitalist modernity—its values of absolute freedom, unchecked individualism, and the relentless pursuit of material progress. Islam does not seek to create a system where man is merely free from economic oppression; rather, it aspires to establish a divine order where man is liberated from the tyranny of his own desires and returns to his true purpose as a servant of Allah.

This revolutionary vision is neither utopian nor abstract. The Islamic world continues to resist the encroachments of capitalist individualism, and despite decades of imperialist attempts to impose neoliberal norms, the social, familial, and spiritual fabric of Muslim societies remains largely intact, Alhamdolillah. Islamic teachings continue to shape economic transactions, social relationships, and political aspirations. Unlike the West, where the market has replaced morality and the self has been commodified, the Muslim world remains deeply connected to its religious, communal, and ethical foundations.

The battle against capitalism is, therefore, not merely a material struggle—it is an ideological, spiritual, and existential contest. While the forces of

global finance seek to entrench economic dependency through exploitative debt structures, and while Western cultural hegemony attempts to erode traditional values, the Islamic resistance persists through grassroots movements, scholarly efforts, and the unwavering commitment of mujahideen. The failure of neoliberalism to uproot the Islamic way of life testifies to the resilience of divine guidance over man-made ideologies.

Moreover, the possibilities of revolution are not confined to the Muslim world alone. The structural contradictions of capitalism continue to deepen in the heartlands of the West. The disillusionment of Western youth, the increasing prevalence of existential crises, and the widespread psychological turmoil of capitalist societies indicate that the so-called "end of history" is far from reality. As capitalism fails to provide meaning, morality, and fulfillment, the path is open for an Islamic alternative. The works of European scholars and Sufi preachers, who have long envisioned an Islamic revival in the West, must be integrated into the broader revolutionary struggle. As Maulana Muhammad Marmaduke Pickthall once remarked, *"The future of Europe is Islam."* The responsibility lies with the committed and conscious Muslim vanguard to channel this potential into a structured and transformative movement.

In conclusion, Han's assertion that revolution is impossible is a reflection of the stagnation and despair of secular thought, not an objective reality. The Islamic

resistance remains vibrant, and the momentum for change continues to build. The global capitalist order is not an unbreakable fortress; rather, it is a fragile construct, riddled with contradictions and internal decay. As long as there are believers committed to the vision of divine justice, the possibility of an Islamic revolution will not only remain alive—it will be realized.

"The sky is painted crimson with the blood of martyrs,
Behold! The dawn of a new revolution is near."

Bibliography

Han, B.-C. (2015). *The Burnout Society*. Stanford University Press.

___. (2017). *Psychopolitics: Neoliberalism and New Technologies of Power*. Verso.

___. (2018). *The Expulsion of the Other: Society, Perception, and Communication Today*. Polity.

___. (2021). *Capitalism and the Death Drive*. Polity.

___. (2024). *The Crisis of Narration*. Polity.

Hardt, M. & Negri, A. (2000). *Empire*. Harvard University Press.

___. (2004). *Multitude: War and democracy in the age of empire*. Penguin.

___. (2009). *Commonwealth*. Harvard University Press.

___. (2019). *Empire, Twenty Years On*. *New Left Review, 120*(Nov-Dec), 67-91.

Capitalist Crisis and Contemporary Critical Theory

Dr. Javed Akbar Ansari

Capitalist crisis may be said to occur when the system and life-word dedicated to accumulation is threatened. These threats may emerge from several differentiated but interrelated causes such as disturbances in geo-chemical biological environmental balances, rising distributional inequalities, increased dysfunctionality of the global system of governance; mass disenchantment with capitalist individual and social norms etc. Marxist theory is expected to provide an explanation for the occurrence of these crises as well as to suggest strategies which lead to an internal transformation of capitalist order in which capital accumulation is dedicated not to the pursuit of private profit but to the promotion of public (state or community) abundance.

This essay seeks to reflect on 21st century Marxist and non-Marxist theory's success or otherwise in achieving these objectives.

Traditionally (i.e. from the 1840s to the early 1970s) Marxist theory saw capitalist crisis as paving the way for proletarian revaluation. They saw this as a prelude to praxis – revolutionary struggle to establish the dictatorship of the proletariat. Twenty-first century critical theories have comprehensively abandoned

praxis – most do not admit existence of the proletariat as a "revolutionary class", let alone admit to establishment of its "dictatorship". Critical theory has now largely been confined to the English departments of elite imperialist universities. It is dominated by the writings of the heirs of the Frankfurt School and of Foucault, neither of whom have anything to do with "praxis".

At the beginning of the 20th century Lenin asked "What is to be done?". Having abandoned praxis, Foucault's heirs can only ask, "what can I do?" within the context of an overwhelmingly dominant capitalist system and life-world. The question of systemic change is necessarily sidestepped. Critique is a process dedicated to "intellectual emancipation".

Critical theorists pretend that such theorizing is itself a form of praxis – though not of praxis leading to proletarian dictatorship (the only systemic transformation of capitalist order that Marx conceives). In this vein Hardt and Negri suggest that understanding capitalist crisis is "playing along with it" in the expectations that it will self-evolve into systemic transformation and no special action is required from the theorists of social change. In a sense therefore critical theory is irrelevant as an analytical framework for understanding systemic transformation. Since the attention of the theorist is

focused on his personal experiences, the range of his policy advocacy is also limited – thus the Marxist litigant can propose and work for the abolition of the death penalty and not for the abolition of the rule of law of capital for capital rules systemically and individuals qua individuals are powerless to challenge capital's systemic governance.

Much of twenty-first century critical theory can be described as post-Marxist for its rejection of the theory of historical materialism and of dictatorship of the proletariat in general. Some thinkers such as Barnard Harrit deny not just the existence of the proletariat as a revolutionary class but also the existence of crisis generating contradictions in the capitalist order. This is not just rejection of Marx but of the Kantian and Hegelian roots of classical critical theory. Habermas view of an idealist communicative sphere in which individuals are free to develop consensus through the exercise of rationality is equally unacceptable to an emancipatory critical theory as is Habermas's view of history as a global learning process. Post-Marxist critical theory also accepts the Deleuzean/ Foucauldian declaration of the equivalence of knowledge and power and thus is skeptical of the existence of a solid normative foundation of its analysis. If there is no truth accessible to reason an appreciation of what a response to crisis is (at least in principle), is ruled out. Whereas

19th century critical theory and (at least some) contemporary advocates of the Frankfurt School assume/agree that critical theory produces a normative order that is correct and serves to specify correct praxis, twenty-first century critical theorists specialize in continuing deconstruction of what appears "reality" thus making praxis practically impossible. Nevertheless, twenty-first century critical theory admits of the possibility of better interpretation of existing evidence.

This better interpretation is often derived from the dynamics of the crisis being addressed. Thus, some twenty-first century critical theorists suggest that counter insurgency as developed by the US army is a "better" response to the ongoing "war on terror" since it is not based on a holistic view of this crisis but was a transformed technology generated in the crisis itself.

Counter insurgency may lead to an end of the "war on terror" (and will thus become dysfunctional itself) but the end of the "war on terror" will not lead to end of crises, for the never-ending struggle for power/resources will continue and critical theorists will need to endlessly reinterpret socio-political configuration.

Critical theory unreservedly endorses liberal values – freedom, equality, rule of law, tolerance, prosperity. In this view the struggle for system change is futile for all systems are man managed and differences between

them are cosmetic. Instead, the aim should be to gradually reform the existing system so as to produce capitalist justice. Values are not seen as eternal but a product of struggle – a bow to Marxism but values formation and promotion is an individual enterprise. Twenty-first century critical theory generally endorses left liberal political movements – Black Lives Matter, the Yellow Vest Movement, seeking reforms in the capitalist order. Another characteristic of these movements strongly endorsed by critical theory is their abstention from seeking state control.

These are movements expressing the desire not to be governed. Critical theory also addresses individual acts of resistance to capitalist governance – whistleblowing, hacking, feminist interventions – without discussing their transformative capacities. Not for nothing has twenty-first century critical theory been characterized as "communitarian anarchism". This is particularly evident in its sustained insistence that "institutions should be allowed to die". Society is to become ungovernable by disengaging from struggles against ruling authorities.

As noted earlier, praxis in their view is a highly personal activity since the act of formulating praxis in a general way involves making 'policies for others'. One must avoid domination of movements such as the Yellow Vests while facilitating them and seeking to persuade public to participate in them. Twenty-first century critical theory is above all pragmatic. Its main message is to abandon the search for truth and to do "whatever works" in existing circumstances – but

political activity is seen as individualistic – not social activity. It is the "care of the self" (as theorized by Foucault) which dominates contemporary critical theory. The argument is that since we cannot change the world, we should concentrate on seeking to subvert power by changing its relationship to ourselves by political activity. This moves contemporary critical theory in the direction of the neoliberal conception of the entrepreneurial, self-inventing self. The problem of collective decision-making and its inevitable normativity is thus ignored. There is an underlying deep skepticism about the possibility of transcending capitalism in twenty first century critical theory.

There is an underlying incoherence between critical theory's advocacy on the one hand of promoting ungovernability and on the other hand of advocating micro policy changes to make capitalism 'more compassionate and respectful'. Critical theory-based praxis – such as it is – leans toward the fiat alternative. Having rejected dialectics/contradiction as constituents of capitalist order, twenty-first century critical theory accepts capitalism's systemic eternality. One gets the impression that capitalism as a historical system is outside the ambit of twenty-first century critical theory.

Is capitalism dying both as a system of governance and a life-world? The death pangs are evident in the never-ending unfolding of several related crises – environmental, moral, social, economic and political. Yet the death is taking a long time and many hope that:

ممکن ہے کہ یہ داشتۂ پیرک افرنگ
ابلیس کے تعویذ سے کچھ روز سنبھل جائے

But the coming death has been foretold – over two centuries ago by those who invented critical theory – Marxists among others. But the Marxist conception of the implosion of capitalism – and the solution they proposed – was false. There are contradictions in the never-ending capitalist accumulative process – but those contradictions do not unfold in the form of property relationships. "Abolishing" private property involves merely its conversion into state or communal property and the contradiction associated with the never-ending accumulation are not eroded by this conversion of "private" into "state" or "common" property. Transcending capitalism requires suppressing the demands of nafs-e-ammara – the move from a society dominated by takathur to a social order characterized by Istighnan and faqr e ghayoor:

لفظ 'اسلام' سے یورپ کو اگر کد ہے تو خیر
دوسرا نام اسی دین کا ہے فقر غیور

So, the Marxist project collapsed – as historical materialism proved to be a fairy tale and as states (USSR, China) and communes (Venezuela) dominated property form crumbled and the old theory lost its conceptual coherence and disappeared; critical theory became dominated by Foucauldian and Nietzschean thinkers.

Twenty-first century critical theory shares with Marxism its underlying transcendental pretense – the presumption that man is god and that the system and

life-world should be dedicated to a quest for freedom, autonomy, and self-determination. This is a false quest for man is not god and ought not pretend to be god. Capitalist order is an attempt to establish man's government – his earthly rule as a free, autonomous, self-determined being. Unlike Marxism, twenty-first century critical theory does not address the commitment to man's rule as a truth claim – but merely as a manifestation of the will to power. In this view capitalist order is eternal and everyone is a subject and an object of the will to power.

The capitalist transcendence – as system and life-world – is impossible/inconceivable since it implies a negation of the will to power – of the quest for the establishment of man's government. So, in contemporary critical theory the only meaningful endeavor is the quest for capitalist justice – i.e. for the removal of the obstacles to the growth of freedom, autonomy, and self-determination. Moreover, since seeking systemic transcendence is incomprehensible the quest for capitalist justice must be individualized. Each man must struggle for promoting "better", compassionate and humane outcomes in his own limited operational sphere and there is no justification for imposing one's conception of "better" outcomes on others.

We conclude that contemporary critical theory does not seek to comprehend capitalist crises and therefore fails to provide solutions for redressing them at the systemic level.

Why Islamic Revolution?

Javed Akbar Ansari

The overwhelming majority of committed Muslims – the *mukhliseen-i-deen* – view "Islamic revolution" as an alien concept. There are good reasons for this but sustaining the revolutionary process, we believe, is necessary for *iqamat-e-deen* in the contemporary world.

In this essay we will try to explain to you why it is necessary that you, as a committed Muslim, support the Islamic revolutionary struggle.

What is Revolution

The basic reason for the unfamiliarity of the concept of revolution in the Muslim lifeworld is the absence of this phenomenon in the twelve hundred years of the Islamic history (from the time of the Prophet صلى الله عليه وسلم to the collapse of the Usmani and Safawi rule).

During this extended historical period society functioned within the ambit of the Shariah, and social and state policy were legitimated on the basis of the Islamic knowledges (fiqh, usul and kalam).

The state guaranteed the systemic dominance of the Shariah and the Islamic knowledges.

As Imam Ibn Khaldun رحمه الله shows struggle against individual rulers and dynasties was aimed at reducing minor deviations from this governance paradigm – not for reconstituting the state.

Revolution is a process for reconstituting the state. It is a constituent of modernity. During the 18th century the feudal/ Christian state was reconstituted in Britain and France (and established in America by the slaughter of 80 million Red Indians) through revolutionary struggle.

Secular, nationalist, liberal states were established through a revolutionary process.

This process was political but it built upon the processes of secularization of individuality and society that had been gaining ground in Europe from the 13th century onwards.

Successful revolutions always depend upon prior and ongoing transformation in individual consciousness and social norms and practices (and through the creation of a state within a state).

What is Islamic Revolution

Islamic states were reconstituted by colonialism during the 19th century through occupation and indoctrination (especially through the exercise of educational soft power).

In the 20th century when Muslim majority states became independent, political power was transferred to the disciples of the colonialists. Virtually all Muslim majority states became nationalist, liberal or socialist republics.

A republic is a state ruled by the law of capital

under a constitution which sanctifies human rights and either abolishes Shariah rules (Pakistan, Nigeria, Turkey) or restricts their application to the personal domain (Saudi Arabia, Brunei, Kuwait). It also delegitimizes Islamic knowledges as a referent of state and social policy.

Islamic revolution is the process of reconstituting the state. It is anti-modern. It delegitimizes the rule of law of capital and the constitutional primacy of human rights.

It seeks the re-establishment of Shariah and the Islamic knowledges (fiqh, usul and kalam) as the sole source of state policy.

The Islamic revolutionary process is anti-modern also in the sense that it rejects all compromises with capitalist ideologies and forms of governance – liberal, nationalist, secularist, social democratic. It seeks to create a jihadi – not a welfare – state.

The classic statement legitimizing the Islamic revolutionary process is to be found in Imam Khomeini's رحمه الله seminal treatise ولایت فقیه. The faqeeh is the والی of the Ummat- the وارث of Prophets.

The faqih was the guardian of the observance of the Shariah and the supremacy of the Islamic knowledges for over 12 hundred years in all Islamic states.

Our Imam argues that it is the faqih's primary responsibility to deconstruct the secular neo-colonial

state and re-establish the systemic rule of the Shariah and the Islamic knolwdges.

This Islamic revolution is a political project for deconstructing the post-colonial state. It is part of the process of اقامت دین not the whole of it. It is specific to the era of the rule of capital and the prevalence of the neo-colonial state.

It is an ijtihad appropriate for the overthrow of Modernist/ Capitalist rule. If and when Modernity/ capitalism is overthrown and Islamic rule is consolidated Islamic revolutionary struggle will no longer be necessary.

Islamic revolutionary struggle has led to the creation of two Islamic states – Iran and Afghanistan. Islamic revolutionary struggle continues in them however because they are under imperialist attack seeking to undermine their social legitimacy at the community level.

They are exceptional Islamic states surrounded by a global *dar-al-harb* which seeks to re-integrate them (as it has successfully re-integrated the Islamic states established in Chechnya, Egypt, Sudan and Mali) within the global capitalist system.

As long as imperialist rule is not conclusively defeated, Islamic revolutionary struggle will (inevitably) continue in Iran and Afghanistan.

Support of the Mukhliseen is Necessary

اے بھائی اگر تم ساتھ نہ دو
تو ہم سے اکیلے کیا ہو گا

The Islamic revolutionary struggle is part of the process of اقامت دین. It is not the whole of it by any means. It depends crucially upon the support of the *mukhliseen-e-deen* individuals and groups who are endeavoring and organizing to promote Islamic individuality, communal life, customs and traditions at the mass level through their propagational (دعوتی), educational, economic, philanthropic and social support activities.

The success of the Islamic revolutionary struggle in Iran and Afghanistan has depended crucially on the rearguard backing and support of *mukhliseen-e-deen*. The defeat of Chechnya, Sudan, Mali, Syria and Iraq is largely due to the fact that the *mukhliseen* of these countries were divided along sectarian lines and stood aloof from the revolutionary struggle.

In these countries many sincere Muslims – both individuals and groups – became allies of the post-colonial rulers.

In Pakistan, the vast majority of *mukhliseen-e-deen*– try to live Islamic lives on an individual basis or working with Islamic groups dedicated to educational or socio-cultural Islah.

All these individuals and groups are relatively powerless subjected to the rule of the law of capital and this powerlessness seriously constrains their *dawah* and *islahi* efforts.

An Islamic state dedicated to the promotion and consolidation of the *dawah* and *Islah* effort is an essential prerequisite for enhancing the social authority of the *mukhliseen*.

History teaches us that the support and back up of Turkish and Pathan sultans was crucially important for the spread of Islam by the Sufia in the 12th and 13th centuries in India (as was the jihad of Imam Alamgeer رحمه الله in 17th century Deccan).

The *mukhliseen* and the Islamic revolutionaries are each other's natural allies. *Islah* and *Inqilab* are complementary not competitive projects – the success of the one (*islah*) depends on the success of the other (*inqilab*) and vice versa.

In Pakistan, the challenge is to Islamize the state order from the bottom up by increasing the social authority and power of the *mukhliseen-e-deen*. The challenge is to integrate the *Islahi* and *Inqilabi* Islamic movements at the national level.

Very little can be achieved without cementing the unity of the Pakistani Islamic groups struggling for اقامت دین.

As our revolutionary poet Sufi Noor Muhammad has said:

حق نوں بولو بلے بلے
رحمت رب نوں بنھ لو پلے
کچھ نہیں بنتا کلم کلے
مل کر بن جاؤ طوفان
اٹھ کلھوتا دیس دے اندر اللہ والیاں دا طوفان
ٹھہر نئیں سکدے طوفاناں دے اگے یہ ماڈرن شیطان

Reform and Revolution

Javed Akbar Ansari

In this paper I will try to think through issues raised by the complexity of the relationship between reformist and revolutionary aspects of contemporary struggles for اقامت دین. My main argument will be (hopefully) to show that both reformist and revolutionary praxes are necessary components of اقامت دین. They are complementary not competitive/substitutive activities.

Islamic Reformism

Reforms اصلاح – are activities related to correcting deviations in individual, social and state functioning and structures from Islamic norms as enumerated in the nusus-i-Sharia and the 'asar of the auliya. Throughout Islamic history the overwhelming majority of Ulema, Sufiya and Sultans have been musliheen. They have struggled and are struggling to reform individual behavior and social and statal practices so that they conform to Islamic norms. It is due to the activities of these musliheen that Islamic individuality and society continues to survive and thrive in the contemporary world.

Islamic reformism's antithesis is modern reformism. Modern reformists endorse the universalist laws of capitalist epistemologies and ethics. Modern reformists seek to legitimate capitalist

valuations and ways of life on the basis of re-interpretation of the نصوص so that Islamic individuality, society and state formation is molded into capitalist forms.

This is a classic strategy of the modern reformists since the 17th century which has enabled them to subsume Christianity, Judaism and (currently) Hinduism within capitalist order. The pioneer of this tradition in the sub-continent was the traitor Syed Ahmad Khan and his contemporary followers include Wahiduddin Khan and the imperialist agent Javed Ghamidi.

Since imperialism's subsumption of the Islamic world Islamic reformists have opposed the growth of modern reformism but in the last few decades, we find this opposition weakening. Thus, we find orthodox ulema such as Maulana Taqi Usmani and Maulana Abul Ala Maududi endorsing capitalist practices through formulation of such concepts as "Islamic banking" and "Theo-democracy".

It is important to understand the reasons behind this weakening of the anti-modernist stance of the Islamic reformist Ulema and Auliya. The fundamental cause of this weakening is the annihilation of the Islamic state by imperialism. The task of safeguarding the functioning and reproduction of Islamic individualities and societies was historically entrusted

to the Islamic rulers and Salateen and the Ulema and Sufia concerned themselves with individual and social reform.

There are no salateen in the Muslim world – except relatively recently in Iran and Afghanistan and the ulema and the auliya find themselves compelled to practice Islamic reform within capitalist state order – to submit to the rule of law of capital in the public sphere and to presume that Muslim majority capitalist states with capitalist governance and structures and valuation processes are (at least in theory or in principle) Islamic.

The Islamic reformist ulema and auliya have effectively failed to accept the reality that while Islamic individuality and society have substantively survived the onslaught of imperialism (thanks largely to the efforts of Islamic reformists) the defeats the mujahideen suffered during the 19th century has led to the extinction of the Islamic state (except in Iran and Afghanistan).

Islamic Revolution

This weakness of Islamic reformist movements can be addressed by Islamic revolutionary struggles. The concept of revolution is unfamiliar in Islamic history because Islamic state continued to exist for more than twelve hundred years since the time of the Prophet صلی اللہ علیہ وسلم. Islamic movements during that long

period of history were reformist movements concerned with reforming the deviation of state practices from socially predominant Islamic norms.

Islamic revolution is the anti-thesis of khuruj. Khuruj is the attempt to reconstitute an Islamic state according to secular/capitalist forms. For example, the modern rebellion (liberal, nationalist, feminist, sectarian) against the Islamic governments of Iran and Afghanistan is Khuruj. Islamic revolution is an attempt to reconstitute a secular/capitalist state on the basis of Islamic principles of governance.

Islamic revolution is specific to the contemporary modern era because Muslim (and non-Muslim) majority states have been secularized/capitalized.

The reformist ulema and auliya misunderstand Maulana Maududi's views on the necessity of Islamic revolutionary struggle. Maulana Maududi has taught that this is a historical necessity. It is necessary because of the systemic dominance of capitalist governance forms and when an Islamic state not threatened by global capitalism is established Islamic revolutionary struggle is no longer necessary (as it was not necessary in the greater part of Islamic history).

Islamic revolutionary practice must be anti-modern if it seeks to reconstruct the capitalist state but in almost all Muslim and non-Muslim states (with the exception of Iran and Afghanistan) Islamic political

activity is contextualized by dominant (national and global) capitalist governance. Thus, the overwhelming majority of Islamic political parties have been reformists and since the scope for Islamic reformation of capitalist governance is limited (as shown by the examples of Turkey, Tunisia and Egypt), Islamic political parties are rapidly succumbing to nationalist reformist pressures.

This is shown most clearly in the case of Jama'at-i-Islamic Pakistan (and India). Revolutionary themes have virtually disappeared from its political discourse. Its electoral agenda is dominated by nationalist, social democratic and liberal claims. It proudly champions the entry of women into public life. Its leadership is dominated by modernists such as Prof. Khurshid Ahmad, Naeem-ur-Rahman and Siraj-ul-Haq. The ulema and auliya have virtually disappeared from its ranks. The Jama'at-i-Islami is committing modernist suicide.

The modernization of Islamic groups be they reformist ulema and auliya or political parties is system endorsing, this does not mean a need to abandon the work they are doing to reform individuals and society rather they must link their work to the political activity of the Islamic revolutionaries. The issue of primacy of tasks – the political or individual islah is irrelevant. It arises from

a fundamental misunderstanding of Maulana Maududi's views. He never argued for the primacy of the political. He argued instead for the necessity of political struggle in contemporary circumstances. In this he was the follower of the mujahideen of the 19th century – of Syed Badshah, Haji Shariatullah, Shaikh-al-Mashaikh Imam Muhajir Makki, Maulvi Ismail Shaheed and the Sadiqpuri Syyeds. The primary cause of the modernization of the Jama'at and its capture by the modernist reformists is abandoning of the Jama'at by the ulema and the auliya.

The Islamic revolutionaries need the support of the Islamic reformists whose work provides foundation for organizing the mass base for Islamic revolutionary struggle. The Islamic reformists need the extension of Islamic revolutionary initiatives for the re-emergence of a governance order articulating Islamic values and governance processes without which the dawah work will always remain confused, haphazard, vulnerable and subject to secular and imperialist penetration. The successful integration of the dawah and revolutionary work by the Islamic reformists and Islamic political forces has proved vitally important for both Islamization of society and the triumph of the Islamic revolution in Iran and Afghanistan.

Review Article: Individuation and the Islamic Revolutionary Process

(A response to Dr. Muhammad Amin's treatise
(امت مسلمه: چلینجز اور ان کا حل

Javed Akbar Ansari

Dr. Ameen is one of our leading ulemas who has spent a lifetime problematizing the process of Islamic individuation, socialization and state formation in the here and now of the 21st century.

The treatise under review represents a succinct summary of his extensive work. I first summarize his views on the strategy to meet contemporary challenges to Islamic thought and civilization and then present a revolutionary appreciation of his discourse. Hence this review focuses on p. 39-48 and I refrain from comments on the rest of the treatise despite my fundamental disagreement with Dr. Amin's analysis of the tendency he analyses as Tatbeeq.

Dr. Amin's Revivalist Strategy

Dr. Amin argues that Islamic thought and civilization currently faces two major challenges (a) the challenge of overcoming decline and (b) the challenge posed by western thought and order. His concept of "decline" remains ambiguous – he dates it variously, sometimes from the 4th century of the Hijrah, sometimes from the 7th and sometimes from the 11th/12th centuries. Nevertheless, his conception of

decline is comprehensive and systematic – "decline" is presumed to have occurred at all levels – individual, societal and state. Here (as elsewhere) the relationship between these concepts of decline is not problematized.

Dr. Amin argues that the necessary and sufficient response to this decline should be the promotion of Islamic knowledge and spirituality. He claims that the Prophet صلی اللہ علیہ وسلم focused entirely on the formation of Islamic individuality. The sole cause of Islamic thought and civilization's supremacy in the world during the 4th, 7th and 11th centuries were Islamic character formation at the individual level. Islamic individuation automatically and spontaneously begets Islam's social and state order. The fundamental cause of Islamic decline is erosion of Islamic individuality and the fundamental cause of this erosion according to Dr. Ameen is the corruption and entropy of the education system.

Hence counteracting زوال depends entirely on nurturing Islamic individuality which automatically/ spontaneously/ unproblematically leads to the dominance of Islamic thought and civilization at the social and state levels. Islamic dominance does not require institution building at the social and state level. Everything depends solely on strengthening Islamic individuation and the only means for this according to

Dr. Ameen is strengthening Islamic educators and promoting Islamic spirituality.

According to Dr. Ameen the challenge of "western" global dominance can be met by deconstructing "western" epistemologies and knowledge systems. Muslims must be taught to reject "western" knowledge and socially and politically conceptualized model building on the basis of Islamic theoretical paradigms must be undertaken. Social and political confrontation with the "west" must be postponed and regarded as "fruitless" until the universalization of Islamic individualities at least in the Muslim world. Elsewhere (Al-Burhan, July 2023, pp. 51-53) Dr. Ameen proposes the establishment of a research academy to undertake the task of constructing Islamic model building in response to contemporary challenges.

Islamic Revolutionary Response

We agree with the need to nurture Islamic individuation. Indeed, we understand systemic decline as a process when Islam ceased to spread in Europe, India, China and Africa despite Muslim political dominance and we date decline from the early Abbasid period and the establishment of Umayyad rule in Spain. We regard the Dawah work among the non-Muslims of Europe, America, China, India and Africa as a key element of the contemporary Islamic revolutionary process and have deep and close links

with the Sufia doing this work.

Islamic revolution is a process and not a state. We recognize individuation as a quasi-societal and statal process. Individuals exist within societies and are governed by specific state orders. It is impossible to "educate" an individual from out of a given social/statal order without institutionalization – that is why a prioritization of individuation over social/statal penetration is an idealist fantasy. Individuation and social/statal reconstructions are simultaneous aspects of the process of اقامت دین. They are not hierarchically structured with promotion of individuality leading to an automatic/ spontaneous reconstruction of social/ statal order.

That is why the Prophet صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم initiated the process of society and state building from the earlier days of Makkah. He tried to establish a Muslim community in Makkah, with its own customs and norms. Islamic legislation in embryonic form also started in Makkah. He صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم established a state within a state in Makkah rejecting the authority of the tribal legislative assembly (ندوہ). In Madina state institution became key instrument for the flourishing of Islamic individuality.

Without social and statal institutionalization individuality remains powerless. Growth of Islamic consciousness must be accompanied by a

simultaneous growth of the social and statal power of the Mukhliseen-e-deen. Without the conquest of state power, Islamic education and spirituality will necessarily remain marginal retreats from secular order.

The power of the state has grown tremendously in capitalist order. The rule of capital is imposed upon society by the capitalist state and capitalist individuality is formed by subservience to capitalist governance. As Mulana Maududi has stressed the key task of the Islamic revolutionaries in the contemporary world is the deconstruction of the capitalist state.

It is the capture of statal power which enables us to foster Islamic individuation in Iran and Afghanistan. Islamic revolutionary movements throughout the world are rightly focused on the struggle to deconstruct the capitalist state either through direct overthrow (as in Iran and Afghanistan) or through a process of enhancing contradictions within capitalist systems of governance i.e. through the social and political empowerment of Mukhliseen-e-deen.

The struggle against capitalist world order is immediately political – a struggle to dispose off capital of its governance authority. Intellectual effort must focus on this vital task. We have established two Islamic states (and InshaAllah soon there will be more in coastal Africa). Both these states are struggling to

avoid absorption within the global capitalist economy and society. Islamic revolutionaries have the primary duty to develop proposals which prevent such re-absorption.

Dr. Ameen's suggestion for the establishment of a research academy is a welcome step. As Islamic revolutionaries we suggest that the work of this institute must focus on the real, here and now, needs and problems that Iran and Afghanistan are facing. As revolutionaries we recognize that theory follows practice – Islamic individuality and society is being fostered through the agency of the Islamic state in Iran and Afghanistan.

Let us participate in this jihad which is underway and avoid the absurdity of abstract model building in the vain hope that some نیک نیت ruler will emerge in Turkey or Saudi Arabia or Pakistan miraculously to concretize our arbitrary abstractions.

As revolutionaries we argue that we cannot theoretically know how Islamic order will be made functional in contemporary circumstances until it is (imperfectly and piecemeal) articulated in several practices. The overcoming of capitalist global hegemony is a centuries-long journey and currently we are only in the beginning of their work.

Book Review

Antony Loewenstein, *The Palestine Laboratory: How Israel Exports the Technology of Occupation Around the World* (Verso Books, 2023), 288 pages

Reviewed by Dr. Syed Z. Arshad

Antony Loewenstein is an Australian independent journalist, writer, and filmmaker known for his investigative work on global politics, the military-industrial complex, and human rights issues. Of Jewish heritage, Loewenstein has been a vocal critic of Israel's occupation of Palestine, Zionism's expansionist policies, and the global arms trade. His journalism has taken him to conflict zones around the world, including Palestine, Afghanistan, and Honduras, where he has examined the intersections of war, capitalism, and authoritarianism.

His motivation for writing *The Palestine Laboratory* stems from years of research into how Israel has turned the occupation into a profitable enterprise, selling surveillance, counterinsurgency, and military technology to governments worldwide. Loewenstein argues that Palestine is not just a site of oppression but a **testing ground** for authoritarian regimes, where repressive tools are developed and exported to sustain global militarization. Through this book, he aims to expose the deep connections between the Israeli military economy and global power structures, urging readers to recognize how the struggle of Palestinians

is tied to a broader system of control and suppression.

Turning Oppression into a Business Model

Loewenstein's *The Palestine Laboratory* is a deeply researched and unsettling account of how Israel has transformed its occupation of Palestine into a profitable global industry. The book exposes how methods of control, surveillance, and military aggression—honed through decades-long suppression of Palestinian resistance—are repackaged as expertise and exported to governments worldwide.

For those who follow the ongoing genocide in Palestine, this book offers a critical perspective: the occupation is not only about territorial expansion but is also about sustaining an entire war/terror economy. Loewenstein demonstrates how weapons, cyber technologies, and intelligence services—tested on Palestinians—are marketed as "battle-proven" and sold to authoritarian regimes, warlords, and security agencies across the world. The occupation, in this sense, is more than a political project; it is an industry that feeds off continuous conflict.

Zionism as a Nationalist Ideology of Capitalism

Loewenstein's book does more than expose the mechanics of Israel's arms industry—it highlights how Zionism has evolved into a nationalist form of capitalism, where the very survival of the Israeli economy is intertwined with perpetual conflict and

militarization.

Historically, Zionism was presented as a movement of self-determination, but *The Palestine Laboratory* reveals how it has become an expansionist economic system dependent on military dominance. Israel's identity as a "Start-Up Nation" is not merely about technological innovation in civilian sectors; it is primarily driven by the security and defense industry. The occupation of Palestine is not just a geopolitical struggle but a business model, where war, surveillance, and suppression generate enormous profits.

Unlike classical colonialism, which sought to extract resources from occupied lands, Zionism integrates occupation into the fabric of economic growth. Israel's leading military corporations—**Elbit Systems, Israel Aerospace Industries (IAI), and Rafael Advanced Defense Systems**—are not just weapons manufacturers but key drivers of economic expansion, exporting technologies that have been developed through the subjugation of Palestinians.

Loewenstein details how Israeli companies market their products as "field-tested" or "combat-proven," a euphemism for having been deployed against Palestinian civilians in Gaza and the West Bank. This militarized economy has led to a situation where the continuation of conflict is financially beneficial for

Israel. The very existence of resistance—whether through armed struggle or civil disobedience—provides justification for the development of new technologies and security measures, ensuring continued demand in the global market.

From an Islamic perspective, this model reflects a deeply exploitative economic order. The Qur'an warns against those who profit from oppression and injustice:

> *"Woe to those who give less [than due], who, when they take a measure from people, take in full, but when they give by measure or weight to them, they cause loss." (Qur'an 83:1-3)*

Israel's military-industrial complex thrives on imbalance—offering "security" to repressive regimes while denying the very concept of security to Palestinians.

The Military Economy and Its Global Reach

Israeli arms manufacturers, such as **Elbit Systems**, **Israel Aerospace Industries (IAI)**, and **Rafael Advanced Defense Systems**, have become dominant players in the global weapons trade, exporting drones, missile defense systems, and electronic warfare technology to over 130 countries. For example, the **Hermes 900** and **Heron TP** drones—developed by Elbit and IAI—have been extensively used for targeted assassinations and aerial surveillance in Gaza before

being sold to nations such as India, Colombia, and Azerbaijan.

Loewenstein also highlights how Israeli missile defense systems, including the **Iron Dome**, are not only developed for national defense but also marketed as high-tech solutions to global security threats. While the system is often portrayed as a defensive measure against rocket attacks, its continuous development and expansion have created a lucrative market, with countries such as the **United States, Germany, and Singapore** purchasing its technology.

Which Countries Are Benefitting?

Israel's military exports have been embraced by governments seeking to enhance internal repression and external military capability. Some of the key clients and beneficiaries of Israeli occupation technologies include:

- **India** – The Indian government has become one of Israel's largest arms customers, purchasing **surveillance drones, missile systems, and border security technologies** that have been deployed in Kashmir, mirroring Israeli tactics in the West Bank.
- **China** – Despite political differences, Israel has supplied **dual-use surveillance and AI technology** to China, which has been used in the repression of Uighur Muslims in

Xinjiang.

- **Saudi Arabia and the UAE** – Gulf nations have quietly engaged in military and cyber-security deals with Israel, with **NSO Group's Pegasus spyware** being used to monitor dissent and suppress opposition movements.
- **Brazil and Colombia** – Both countries have used Israeli **counterinsurgency technologies and training** to crack down on indigenous and leftist movements.
- **Hungary and Poland** – European far-right governments have employed Israeli security firms to strengthen mass surveillance and border control.
- **The United States** – The US has used Israeli battlefield-tested technologies for urban policing, counter-terrorism operations, and **border security along the Mexico border**.

The Expansion of Surveillance and Control

Beyond arms sales, *The Palestine Laboratory* delves into Israel's export of security technology. One of the most notorious examples is the **Pegasus spyware**, developed by **NSO Group**, which has been sold to numerous governments for monitoring political opponents, journalists, and activists.

Additionally, Israeli AI-driven surveillance technologies—such as **Blue Wolf**, a facial recognition

system deployed in the West Bank—are used to catalogue and monitor Palestinians, creating a vast biometric database that facilitates movement restrictions and targeted repression. This same technology has been marketed to the United States and European countries under the guise of border security solutions.

The Prophet Muhammad (صلی اللہ علیہ وآلہ و سلم peace be upon him) taught that oppression is a darkness on the Day of Judgment (*Sahih Muslim*). As such, Muslims must remain vigilant and recognize that the struggle against injustice is not limited to one region but is interconnected across the globe.

Final Thoughts

Antony Loewenstein's *The Palestine Laboratory* is an essential read for those seeking to understand the deeper mechanisms of the occupation. It exposes how Zionism has evolved into an economic system that profits from endless conflict, turning war, surveillance, and repression into marketable assets.

For Muslims, the book offers an urgent lesson: the struggle for Palestine is not just about one nation's suffering—it is about resisting a global order that profits from endless conflict.

Verdict: Highly Recommended

فارم برائے سالانہ خریداری سہ ماہی "اسلامی انقلاب"

نام
ای میل
موبائل نمبر
پوسٹل ایڈریس
زراعانت فی شمارہ: ۲۵۰روپے سالانہ: ۱۰۰۰روپے پانچ سال: ۴۰۰۰روپے
طریقہ ادائیگی Easypaisa # 0341-2304766 Money Order #
پیغام

خواہش مند قارئین فارم مکمل کر کے مندرجہ ذیل پتہ پر ارسال کریں۔

امین اشعر، مدیر منتظم سہ ماہی اسلامی انقلاب

اے ۹، معمار بنگلوز، فیز ۲، احسن آباد سیکٹر ا، اسکیم ۳۳ کراچی

فون نمبر: 0333-2122756